Undergraduate Program
Ability Enhancement Courses (AEC) (MIL)
اردو شاعری: قواعد اور بلاغت کا مطالعہ
Urdu Shaeri: Qawaed aur Balagat ka Mutala (2CP)
Course Code: AECL205
Book Code: AECL2051

یشونت راؤ چوہان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی ज्ञानगंगा घरोघरी

Semester-III

کتاب: اول

Book: 01

اردو غزل کا مطالعہ

Urdu Ghazal Ka Mutala

مصنف: ڈاکٹر رشید اشرف خان

اکائی 1 : میر تقی میر اور مرزا غالب

اکائی 2 : مومن خان مومن اور داغ دہلوی

اکائی 3 : فراق گورکھپوری اور حسرت موہانی

اکائی 4 : جگر مرادآبادی اور ناصر کاظمی

Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University, Nashik

Vice-Chancellor: Prof. Sanjeev Sonawane

Director : Prof. Nagarjun Wadekar, School of Humanities and Social Sciences

School Council, School of Humanities and Social Sciences

Prof. Nagarjun Wadekar (Chairman)
Director, School of Humanities
and Social Sciences,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Prof. Jaideep Nikam
Director and Senior Professor, School
of Continuing Education,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Prof. Shivaji Sargar
Director, Distance and Online
Education Centre, University of
Mumbai, Vidyanagari,
Kalina, Mumbai (MS)

Prof. Prakash Pawar
Head, Department of Political Science,
Shivaji University, Vidyanagar,
Kolhapur (MS)

Prof. Rajendra Kumbhar
(Retired) Head, Department of
Library and Informatics, Savitribai
Phule Pune University,
Ganeshkhind Road, Pune (MS)

Prof. Sanjay Tambat
Head, Department of
Communication and Journalism,
Savitribai Phule Pune
University,
Ganeshkhind Road, Pune (MS)

Prof. Chetana Kamalaskar
Director, School of Science,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Prof. Sandeep Chaudhary
Head, Department of Sociology,
Saraswati Bhuvan College, Saraswati
Colony, Aurangpura, Chhatrapati
Sambhajinagar (MS)

Prof. Devendra Ingale
Head, Department of History,
Moolji Jaitha College
(Autonomous), Jalgaon (MS)

Dr. Latika Gaikwad
Associate Professor,
School of Commerce and Management,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Dr. Subhash Sonune
Assistant Professor,
School of Education,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Programme Advisory Committee (PAC)

Prof. Nagarjun Wadekar (Chairman)
Director, School of Humanities and
Social Sciences,
Y.C.M. Open University,
Nashik (M.S.)

Prof. Mohammad Shahid Husain
Former Chairman,
Centre of Indian Languages,
School of Language, Literature and
Culture Studies, JNU, New Delhi

Prof. Mohd. Moazzamuddin
Department of Education in
Languages, NCERT,
Sri Aurobindo Marg,
New Delhi

Prof. Mohd. Mahfooz Khan
(Ahmad Mahfooz)
Head, Department of Urdu,
Jamia Millia Islamia,
New Delhi

Prof. Abu Shaheem Khan
Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu
University, Hyderabad, (T.S.)

Prof. Shah Alam
Department of Urdu,
Jamia Millia Islamia,
New Delhi

Prof. Sardar Pasha
Head, Department of Urdu,
Azad Mahavidyalaya,
Ausa Latur (M.S.)

Prof. Quazi Naweed A. Siddiqui
Head, Department of Urdu,
Maulana Azad College,
Sambhajinagar (M.S.)

Dr. Pervez Ahmed
Associate Professor,
Centre of Indian Languages,
JNU, New Delhi

Dr. Abu Omair (Omair Manzar)
Associate Professor,
Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus, Lucknow

Dr. Abdullah Imteyaz Ahmad
Associate Professor and Head,
Department of Urdu,
University of Mumbai, Mumbai

Dr. Wazhul Qamar Siddiqui
Assistant Professor,
Department of Urdu,
University of Mumbai, Mumbai

Course Code : AECL205, Book Code : AECL2051, Book Title : Urdu Ghazal ka Mutala

Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University

Vice Chancellor : Prof. Sanjeev Sonawane

Director: Prof. Nagarjun Wadekar, School of Humanities and Social Sciences

Writer

Dr. Rasheed Ashraf Khan
Academic Coordinator (Assistant Professor)
School of Language, Literature and Culture Studies
YCMOU, Nashik

Editor

Review Committee

Prof. Ahmad Khan
Centre for Urdu Culture Studies,
Maulana Azad National Urdu University,
Gachibowli Hyderabad-500032

Prof. Sayyed Zakir Ali
Ex. Principal Kohinoor College Khudabad
Plot No. 04, Near Madarsa Anwar ul uloom
Almas colony, Mehrun, Jalgaon -425003 (M.S)

Dr. Sanjay Kumar
Associate Professor and Head
Department of Urdu, University of Allahabad
Prayagraj, Uttar Pradesh-211002

Dr. Ansari Masood Akhtar
Associate Professor and Head
Department of Urdu,
MSS's Ankushrao Tope College, Jalna (M.S.)

Dr. Anwaruddin
Associate Professor , Department of Urdu
Govt. Degree College for Women
Husaini Alam, Hyderabad-500046

Dr. Abdurrab
Associate Professor,
Department of Urdu, Maulana Azad College
Chhatrapati Sambhajinagar, Maharashtra-431001

Programme Coordinator

Dr. Rasheed Ashraf Khan
Academic Coordinator (Assistant Professor)
School of Language, Literature and Culture Studies
YCMOU, Nashik

IT & Language Editor

Dr. Rasheed Ashraf Khan
Academic Coordinator (Assistant Professor)
School of Language, Literature and Culture Studies
YCMOU, Nashik

Production

Mr. Vilas Badhan
Head, (Act.) Print Production Centre, YCMOU, Nashik

© **2026** Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University, Nashik

☆ **First Edition:** December, 2026 **Publication No.:**
☆ **Proof Reader:** Mr. Azmatullah Siddiqui
☆ **Printed by:**
☆ **Published by :** Registrar, Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University, Nashik
ISBN:

وائس چانسلر کا پیغام

عزیز طلبہ!

یشونت راؤ چوہان مہاراشٹرا اوپن یونیورسٹی کے بی۔اے اردو کے ڈگری پروگرام میں داخلہ لینے پر میں آپ کو دل کی گہرائیوں سیمبارکباد پیش کرتا ہوں! اس تعلیمی پروگرام کی کتابیں آپ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔

گزشتہ تیس برسوں میں یونیورسٹی نے معاشرے کی ضروریات کے مطابق مہارت پر مبنی تعلیمی پروگراموں کی ترقی کو ترجیح دی ہے اور ریاست کے طلبہ کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ صرف روایتی تعلیم پر زور دینے کے بجائے، علم کو روزمرہ زندگی میں اپنے اور سماج کے فائدے کے لیے کیسے استعمال کیا جائے، یہ سکھانے کی مسلسل کوشش کی گئی ہے۔ جن طلبہ کی تعلیم کسی بھی وجہ سے منقطع ہوگئی تھی، انہیں اعلیٰ تعلیم کے مرکزی دھارے میں واپس آنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ کام کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے قابل لچکدار نظام، جیسے کورس مکمل کرنے کے لیے اضافی وقت، کم فیس اور طلبہ مرکز طریقہ کار، اوپن ایجوکیشن سسٹم کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ یونیورسٹی نے تعلیم کے مواقع کو جمہوری بنا کر ان طلبہ کو بھی مرکزی دھارے میں شامل کیا ہے جو مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکے تھے۔

حکومت اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی رہنما ہدایات، مختلف اداروں اور تنظیموں کے تاثرات، اور بدلتے وقت کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے یونیورسٹی نئے نئے تعلیمی پروگرام تیار کرتی ہے۔ مختلف مضامین کے ماہرین کے ذریعے تیار کی گئی معیاری کتابیں طلبہ کو مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ اوپن یونیورسٹی کی تیار کردہ یہ کتابیں اس کی پہچان بن چکی ہیں، جس پر مجھے فخر ہے۔ اس طرح یونیورسٹی نے ''گیان گنگا گھر و گھری''، یعنی علم کو گھر گھر پہنچانے والا نظام قائم کر کے ریاست کی ترقی میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

اردو ہمارے ملک کی ایک بڑی رابطے کی زبان ہے۔ ریاست مہاراشٹر میں اس زبان کے بولنے، سمجھنے اور پڑھنے والوں کی کثیر تعداد رہتی ہے۔ اردو کی اسی آبادی کو مرکز نگاہ میں رکھ کر یونیورسٹی نے بی۔اے اردو فاصلاتی نظام کے تحت گزشتہ کئی برسوں سے ریاست کے طول و عرض کی اردو آبادی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یونیورسٹی نے بی۔اے اردو فاصلاتی تعلیم کا آغاز کر کے اردو کی بڑی آبادی کو فیضیاب ہونے کے مواقع فراہم کرنے کا ایک خوشگوار اور اہم فیصلہ کیا ہے۔ بی۔اے کرنے کے بعد طلبا و طالبات کو مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع دستیاب ہوں گے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یشونت راؤ چوہان مہاراشٹرا اوپن یونیورسٹی بی اے اردو کے اس تعلیمی پروگرام کی تشکیل کی ہے، جسے ملک کے ماہر اور تجربہ کار اسکالرز نے تحریر کیا ہے۔ اس پروگرام میں اردو ادب کے ساتھ ہندوستان اور دنیا کی تاریخ کے علاوہ صحافت، فلم، تحقیق، تراجم، کلچر اور ٹیکنکل جیسے نئے مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سے طلبہ کو روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے اور ان کی تحقیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا۔

روایتی تعلیمی نظام میں طلبہ کے لیے کالجوں میں روزانہ کلاسز ہوتی ہیں، جبکہ فاصلاتی تعلیم کے نظام میں تعطیلات کے دنوں میں رابطہ سیشنز منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس نظام میں پیشہ ورانہ اور خاندانی ذمہ داریوں کے ساتھ تعلیم مکمل کرنا متوقع ہے۔ رابطہ سیشن میں شرکت سے پہلے متعلقہ کورس اور اس کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ آپ اپنی مشکلات اور سوالات اساتذہ سے پوچھ کر حل کر سکیں۔ یونیورسٹی کا موقف ہے کہ یہ سیشنز یک طرفہ لیکچر کے بجائے مباحثے پر مبنی ہونے چاہئیں۔ یونیورسٹی نے آڈیو ویژول ذرائع کا مؤثر استعمال کرتے ہوئے مختلف ماہرین کے لیکچرز اور انٹرویوز اپنے یوٹیوب چینل پر دستیاب کرائے ہیں، جنہیں ضرور دیکھنا چاہیے۔

آج کے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں انتظامیہ میں ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے استعمال کے ذریعے پیپر لیس نظام پر زور دیا جا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں یونیورسٹی کے مختلف کورسز کی کتابیں ڈیجیٹل شکل میں یونیورسٹی کی ویب سائٹ www.ycmou.ac.in پر بھی دستیاب کرائی گئی ہیں، جو طلبہ، اساتذہ اور شوقین افراد کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔ یونیورسٹی کی کتابوں کے بارے میں آپ کی آراء کا خیر مقدم ہے۔

آپ کے مستقبل کے لیے ایک بار پھر نیک تمنائیں!

اردو شاعری: قواعد اور بلاغت کا مطالعہ (AECL205)

کورس کی ساخت

کتاب اول: اردو غزل کا مطالعہ

کائی 1 : میر تقی میر اور مرزا غالب
اکائی 2 : مومن خان مومن اور داغ دہلوی
اکائی 3 : فراق گورکھپوری اور حسرت موہانی
اکائی 4 : جگر مرادآبادی اور ناصر کاظمی

کتاب دوم: اردو نظم کا مطالعہ

اکائی 1 : نظیر اکبرآبادی اور حالی
اکائی 2 : اقبال اور چکبست
اکائی 3 : اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی
اکائی 4 : فیض احمد فیض اور اختر الایمان

اردو شاعری: قواعد اور بلاغت کا مطالعہ (AECL205)

کورس کا تعارف

''اردو شاعری: قواعد اور بلاغت کا مطالعہ'' (AECL205) اردو زبان و ادب کے اہم شعری، لسانی اور فنی پہلوؤں کے مطالعے پر مبنی ایک جامع کورس ہے۔ اس کورس میں کتاب اول ''اردو غزل کا مطالعہ'' اور ''کتاب دوم ''اردو نظم کا مطالعہ'' شامل ہیں۔ دونوں کتابوں کے ذریعے طلبہ کو اردو شاعری کی اہم اصناف، شعری روایت، فکری رجحانات، زبان و بیان اور اسلوبی خصوصیات سے واقف کرایا جائے گا۔

کتاب اول ''اردو غزل کا مطالعہ'' میں اردو غزل کے اہم اور نمائندہ شعرا کے منتخب کلام کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ میر تقی میر اور مرزا غالب کی شاعری کے ذریعے کلاسیکی اردو غزل کے فکری اور فنی پہلوؤں کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔ مومن خان مومن اور داغ دہلوی کے کلام سے عشق، رومان، زبان کی شیرینی اور اسلوب کی دلکشی کا مطالعہ کیا جائے گا۔ فراق گورکھپوری اور حسرت موہانی کی شاعری کے ذریعے جدید فکری رجحانات، انسانی جذبات، عشق اور قومی شعور کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔ جگر مرادآبادی اور ناصر کاظمی کی غزلوں کے مطالعے سے رومانوی احساس، سوز و گداز، تنہائی، ہجر اور جدید زندگی کے تجربات سے واقفیت حاصل ہوگی۔

کتاب دوم ''اردو نظم کا مطالعہ'' میں اردو نظم کے اہم شعرا اور ان کے منتخب کلام کا مطالعہ شامل ہے۔ نظیر اکبرآبادی اور حالی کی شاعری کے ذریعے اردو نظم کی ابتدائی، اصلاحی اور عوامی روایت کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔ اقبال اور چکبست کی نظموں میں فلسفیانہ فکر، قومی جذبات، تہذیبی شعور اور انسانی اقدار کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی کی شاعری کے ذریعے رومان، جذبات، آزادی اور انقلابی فکر کے مختلف پہلو نمایاں ہوں گے۔ فیض احمد فیض اور اختر الایمان کی نظموں کے مطالعے سے جدید اردو نظم کے فکری، سماجی اور اسلوبی رجحانات سے واقفیت حاصل ہوگی۔ اس کورس کے ذریعے طلبہ شعری زبان کے درست استعمال، قواعدِ زبان، بیان کے مختلف طریقوں اور بلاغی خصوصیات کو شعری متون کے تناظر میں سمجھ سکیں گے۔ مختلف شعرا کے کلام میں الفاظ کے انتخاب، جملوں کی ساخت، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز اور دیگر بلاغی عناصر کا مطالعہ طلبہ کے لسانی اور ادبی شعور کو فروغ دے گا۔

مجموعی طور پر ''اردو شاعری: قواعد اور بلاغت کا مطالعہ'' طلبہ کو اردو شاعری کے کلاسیکی اور جدید رجحانات کے ساتھ زبان کے قواعد اور بلاغت کے عملی استعمال سے روشناس کرانے والا اہم کورس ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ میں شعری متن فہمی، زبان و بیان کی صحت، ادبی تجزیے اور تنقیدی مطالعے کی صلاحیتیں مزید مستحکم ہوں گی۔

اردو شاعری: قواعد اور بلاغت کا مطالعہ (AECL205)

کورس کے مقاصد اور نتائج

کورس کے مقاصد Objectives

1. طلبہ کو اردو غزل اور نظم کی اہم شعری روایات، نمایاں شعرا اور ان کے فکری و فنی رجحانات سے روشناس کرانا۔
2. طلبہ کو شعری متون کے ذریعے اردو زبان کے قواعد، درست لسانی استعمال اور اسلوبی خصوصیات سے واقف کرانا۔
3. طلبہ میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز اور دیگر بلاغی عناصر کو شعری کلام میں سمجھنے اور پہچاننے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
4. طلبہ میں اردو شاعری کے فکری، فنی، لسانی اور بلاغی پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت کو فروغ دینا۔

کورس کے نتائج Outcomes

1. طلبہ اردو غزل اور نظم کے منتخب شعرا کے کلام کی فکری اور فنی خصوصیات کی وضاحت کر سکیں گے۔
2. طلبہ شعری متون میں قواعدِ زبان کے درست استعمال اور لسانی خصوصیات کی نشان دہی کر سکیں گے۔
3. طلبہ شعری کلام میں موجود مختلف بلاغی صنعتوں اور اسالیبِ بیان کی شناخت اور تشریح کر سکیں گے۔
4. طلبہ منتخب شعری متون کا فکری، فنی، لسانی اور بلاغی نقطۂ نظر سے تجزیہ پیش کر سکیں گے۔

کتاب1: اردوغزل کا مطالعہ (AECL2051)

کتاب کا تعارف

زیرِنظر کتاب ''اردوغزل کا مطالعہ'' چار اکائیوں پر مشتمل ہے۔ مذکورہ کتاب ''قواعد و بلاغت'' کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مرتب کی گئی ہے، جس میں شعری متون کے لسانی اور فنی پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ کتاب میں شعرا کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے زبان کے درست استعمال، جملوں کی ساخت اور قواعدی خصوصیات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز اور دیگر بلاغی عناصر کی مدد سے اشعار کے حسنِ بیان اور معنوی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح کتاب طلبہ میں اردو شاعری کے فنی و جمالیاتی مطالعے کے ساتھ قواعدی صحت اور بلاغی شعور پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

کتاب کی پہلی اکائی ''میر تقی میر اور مرزا غالب'' ہے۔ اس اکائی میں اردو غزل کے دو عظیم کلاسیکی شعرا ''میر تقی میر اور مرزا غالب'' کی شاعری کا مطالعہ شامل ہے۔ میر تقی میر کی غزل میں عشق، ہجر، سوز و گداز اور انسانی جذبات کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ ان کی شاعری سادگی، دردمندی اور اثر آفرینی کے اعتبار سے نمایاں ہے۔ مرزا غالب کی غزل میں ندرتِ خیال، فلسفیانہ فکر، تخیل اور معنی آفرینی کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ غالب نے اردو غزل کو فکری وسعت اور نئے شعری امکانات عطا کیے۔ اس اکائی کے ذریعے دونوں شعرا کے فکری و فنی رجحانات اور زبان و بیان کا مطالعہ کیا جائے گا۔ دوسری اکائی میں ''مومن خان مومن اور داغ دہلوی'' کی غزل گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مومن کی شاعری میں عشق و محبت، جذبات کی لطافت اور نزاکتِ خیال نمایاں ہے۔ ان کی زبان میں شیرینی اور اسلوب میں رومانوی کیفیت پائی جاتی ہے۔ داغ دہلوی کی غزل میں عشق، حسن، رومان اور زندگی کے مختلف جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ داغ کی زبان سادہ، رواں، برجستہ اور محاوراتی ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے طلبہ دونوں شعرا کے شعری مزاج اور اسلوبی خصوصیات کو سمجھ سکیں گے۔

تیسری اکائی کا عنوان ''فراق گورکھپوری اور حسرت موہانی'' ہے۔ اس اکائی میں ''فراق گورکھپوری اور حسرت موہانی'' کی غزل کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ فراق کی شاعری میں عشق، انسانی جذبات، فطرت اور جدید احساس کی عکاسی نمایاں ہے۔ انہوں نے کلاسیکی غزل کی روایت کو جدید فکری شعور سے ہم آہنگ کیا۔ حسرت موہانی کی غزل میں عشق، خلوص، سادگی اور قومی شعور کے عناصر نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی روایت کے ساتھ جدید سماجی اور قومی احساس بھی نظر آتا ہے۔ اس اکائی کے ذریعے طلبہ دونوں شعرا کی فکری اور فنی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔ کتاب کی چوتھی اور آخری اکائی میں ''جگر مرادآبادی اور ناصر کاظمی'' کی غزل گوئی کا مطالعہ شامل ہے۔ جگر کی شاعری میں عشق، رومان، جذبات، حسن اور سوز و گداز کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی غزل میں ترنم، موسیقیت اور جذباتی اثر آفرینی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ناصر کاظمی نے جدید انسان کی تنہائی، اداسی، یاد، ہجرت اور داخلی احساسات کو اپنی غزل کا موضوع بنایا۔ ان کی شاعری میں سادگی، نرمی، موسیقیت اور فطرت نگاری نمایاں ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے طلبہ جگر اور ناصر کاظمی کے فکری و فنی رجحانات اور اسلوبی خصوصیات کو سمجھ سکیں گے۔

طلبہ کی سہولت کے پیشِ نظر ہر اکائی کے درمیان خود اکتسابی سوالات اور اکائی کے آخر میں ان کے جوابات دیے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی معلومات کی جانچ خود کر سکیں۔ اس کے علاوہ مشقی سوالات بھی ہر اکائی میں شامل کیے گئے ہیں۔ مشکل لفظوں کے معانی بھی طلبہ کی سہولت کے لیے درج کیے گئے ہیں۔ آخر میں مزید مطالعے کے لیے موضوع سے متعلق اہم کتابوں کے نام درج ہیں تاکہ طلبہ ان سے استفادہ کر سکیں۔

اکائی 1 : میراورغالب کی غزلیں

ساخت

1.0 مقاصد
1.1 تمہید
1.2 موضوع کی وضاحت
1.2.1 غزل1 پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
1.2.2 غزل کی تشریح
خوداکتسابی کے لیے سوالات I
1.2.3 غزلII دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
1.2.4 غزل کی تشریح
1.2.5 زبان کی مہارتیں
خوداکتسابی کے لیے سوالات II
1.3 الفاظ اور معنی
1.4 خوداکتسابی سوالات کے جوابات I
خوداکتسابی سوالات کے جوابات II
1.5 خلاصہ
1.6 خوداکتسابی کے لیے مشق
تحریری سرگرمیاں
کام کا تجربہ
1.6 مشقی سوالات
1.7 مزید مطالعے کے لیے کتب

1.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔۔۔۔

1.1 تمہید

اردو شاعری کی بات کرتے ہوئے جن دو ناموں کا تذکرہ ضرور کیا جاتا ہے وہ میر اور غالب ہیں۔ یہ اکائی انہی دو شاعروں کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ آیئے سب سے پہلے ان دونوں شاعروں کے بارے میں چند ضروری اور بنیادی باتیں معلوم کر لی جائیں اور پھر ان کی غزل پڑھی جائے گی۔

میر تقی میر اردو کے بڑے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ 28 مئی 1723 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد تقی تھا اور 'میر' تخلص تھا۔ ان کے والد ایک نیک اور دین دار بزرگ تھے، لیکن میر کی عمر کم ہی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کی وفات کے بعد گھر کا ماحول بھی میر کے لئے سازگار نہ رہا۔ سوتیلے بھائی نے ان کا خیال نہ رکھا، اس لیے وہ کم عمری میں دہلی آ گئے۔ دہلی میں کچھ بڑے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا، مگر یہ سہارا بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد حالات پھر بگڑ گئے اور میر کو کبھی دہلی، کبھی آگرہ اور کبھی لکھنؤ کا سفر کرنا پڑا۔ زندگی کے یہ نشیب و فراز ان کی شخصیت میں حساسیت بڑھاتے گئے اور انہی رنجیدہ تجربات نے میر کے دل میں غم کی ایک مستقل کیفیت پیدا کی، جو ان کی شاعری میں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ تعلیم کے شوق میں میر نے دہلی کے مشہور عالم سراج الدین آرزو سے علم حاصل کیا۔ انہوں نے میر کی فکری تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ میر کو جوانی میں ایک ناکام عشق نے بھی سخت متاثر کیا۔ یہ عشق ان کی ایک مثنوی 'خواب و خیال' میں جھلکتا ہے۔ میر نے ایک ہنگامہ خیز زندگی گزاری اور ہمیشہ روزگار اور سکون کی تلاش میں بھٹکتے رہے۔

میر تقی میر نے اردو شاعری میں بہت بڑا مقام حاصل کیا۔ وہ 'خدائے سخن' کہلاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سادگی، سلاست اور گہرے جذبات ملتے ہیں۔ وہ عام الفاظ میں بڑے خیالات کہنے کا ہنر رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں غمِ عشق، دنیا کی ناپائیداری اور انسانی جذبات کی تصویریں نمایاں ہیں۔ ان کے اشعار میں موسیقیت بھی بھرپور ہے۔ پڑھنے والا ان کے لہجے میں درد، نرمی اور سچائی محسوس کرتا ہے۔

انہوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے چھ اردو دیوان مشہور ہیں۔ انہوں نے فارسی میں بھی ایک دیوان لکھا۔ میر کی مثنویاں بھی بہت معروف ہیں جن میں دریائے عشق، جوشِ عشق، معاملاتِ عشق اور اعجازِ عشق نمایاں ہیں۔ ان کی نظموں کی تعداد بھی خاصی ہے اور ان میں مذہبی، مدحیہ اور تاریخی موضوعات پر مشتمل نظمیں شامل ہیں۔ نثر میں بھی میر نے اہم کام کیا۔ 'نکات الشعراء' فارسی میں اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے۔ 'ذکرِ میر' ان کی خودنوشت سوانح ہے۔ 'فیضِ میر' انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے لکھی۔ ان تحریروں میں میر کی شخصیت، ان کے زمانے اور ان کے فن کا اچھا عکس ملتا ہے۔

اردو کے بڑے ناقدین اور شاعروں نے میر کے مقام کا اعتراف کیا ہے۔ مرزا غالب نے میر کے تعلق سے ایک بہت مشہور شعر کہا تھا

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میر نے زندگی کے آخری برس لکھنو میں گزارے۔ شہر سے شکایت کے باوجود وہ وہیں رہے اور وہیں 21 ستمبر 1810 کو تقریباً نوّے برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ میر تقی میر اپنی بھرپور اور غم سے بھری زندگی کے باوجود اردو شاعری کو ہمیشہ کے لیے مالا مال کر گئے۔ ان کا کلام آج بھی دلوں کو چھوتا ہے اور انہیں ادب میں ایک بلند مقام دیتا ہے۔

مرزا غالب اردو کے سب سے بڑے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا اصل نام مرزا اسد اللہ بیگ خان تھا۔ وہ 27 دسمبر 1797ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ترک نژاد مغل نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ چچا نصر اللہ بیگ نے پرورش کی، لیکن وہ بھی جلد وفات پا گئے۔ اس کے بعد غالب نے کم عمری ہی میں زندگی کی سختیاں دیکھ لیں۔ غالب نے ابتدائی تعلیم فارسی اور عربی میں حاصل کی۔ وہ بچپن ہی سے ذہین اور تخلیقی مزاج کے تھے۔ انہوں نے بہت کم عمر میں شاعری شروع کی۔ پہلے 'اسد' تخلص اختیار کیا، پھر 'غالب' لکھنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ شاعری ان کے خاندان کا پیشہ نہیں تھا، مگر وہ اپنے فن کو عزت اور وقار دینا چاہتے تھے۔

تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔شادی کے بعد اخراجات بڑھ گئے اور وہ قرض میں ڈوبتے گئے۔اسی وجہ سے انہیں پوری زندگی مالی مشکلات کا سامنا رہا۔شادی کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گئے اور عمر بھر وہیں رہے۔انہوں نے مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کے عروج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔یہی زمانہ ان کی فکر میں گہرائی لانے کا سبب بنا۔

غالب کی شاعری نے اردو غزل کو ایک نیا رخ دیا۔انہوں نے محبت، غم، فلسفہ، انسانی نفسیات اور زندگی کے پیچیدہ سوالات پر بہت منفرد انداز میں بات کی۔ان کی غزلیں عام قاری کو بھی متاثر کرتی ہیں اور اعلیٰ ادب کے شائقین کو بھی سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ان کا سب سے مشہور مجموعہ دیوانِ غالب ہے، جو اردو شاعری کا ایک لازوال شاہکار ہے۔فارسی میں بھی انہوں نے دیوان مرتب کیا، جو ان کی زبان دانی اور فکری وسعت کا ثبوت ہے۔نثر میں عودِ ہندی اور مکاتیبِ غالب خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ان کے خطوط نے اردو نثر کو ایک نئی سادگی اور روانی دی۔

اردو ادب کے بڑے نقادوں نے غالب کے مقام کو تسلیم کیا ہے۔ان کی زندگی پر فلمیں اور ڈرامے بنے۔غالب کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں عزت ملی۔وہ شاہی شاعر اور مورخ مقرر ہوئے۔انہیں 'نجم الدولہ، دبیر الملک اور مرزا نوشہ' جیسے القابات ملے۔15 فروری 1869ء کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔وہ درگاہ حضرت نظام الدین کے قریب سپردِ خاک ہوئے۔

اس اکائی میں ہم اردو کے دو عظیم شاعروں، میر تقی میر اور مرزا غالب، کی غزلوں اور ان کے ادبی مقام کا مطالعہ کریں گے۔اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ نہ صرف ان شاعروں کی زندگی اور ان کے فن سے واقف ہوں بلکہ ان کی منتخب غزلوں کا تفصیلی تجزیہ بھی سیکھیں۔یہاں ہم ان غزلوں میں موجود جذبات، خیال، زبان، اسلوب اور فنی خوبیوں کو آسان اور واضح انداز میں سمجھائیں گے۔

اس کے ساتھ ہم زبان کی بنیادی مہارتوں پر بھی بات کریں گے۔طلبہ کو الفاظ کے استعمال، جملوں کی ساخت، اور معنی کی تہوں کو سمجھنے میں مدد دی جائے گی۔اگلی اکائیوں میں قواعدِ زبان کے اہم نکات بھی شامل کیے جائیں گے تاکہ طلبہ صحیح اور مؤثر طریقے سے اردو لکھ اور پڑھ سکیں۔نیز علمِ بیان اور علمِ بدیع سے متعلق آسان مفاہیم بھی بیان کیے جائیں گے، جیسے تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مبالغہ، صنعتِ تضاد، صنعتِ تکرار وغیرہ، تاکہ طلبہ غزل کے حسنِ بیان کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

1.2 موضوع کی وضاحت

1.2.1 غزل I

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماری دل کی رسم شہر حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے

کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اڑتے ہوا میں سارے اپنے اساریٰ جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے

کیا کیا فتنے سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوار چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارہ جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میؔر بھی ناداں تلخی کش
دم دار آب تیغ کو اس کے آب گوارا جانے ہے

1.2.2 میر کی غزل کی بنیادی خصوصیات

اس سے پہلے کی ہم پیش کردہ غزل کی تشریح کریں آیئے پہلے میر کی شاعری کے تعلق سے چند انتہائی ضروری باتیں جان لیں۔ بلاشبہ میر تقی میر اردو غزل کے وہ عظیم شاعر ہیں جن کی شاعری نے اردو ادب کو ایک نیا رنگ اور نئی پہچان دی۔ ان کی غزلوں کی سب سے نمایاں خوبی ان کا سادہ، دل نشین اور سچا انداز ہے۔ میر مشکل الفاظ اور مشکل تراکیب سے زیادہ دل کے جذبات اور احساسات کو اہمیت دیتے ہیں، اسی لیے ان کا شعر سیدھا دل پر اثر کرتا ہے۔ ان کی غزلیں اس قدر سادہ اور عام فہم ہیں کہ ایک عام قاری بھی انہیں بآسانی سمجھ لیتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ میر کی زبان بالکل وہی ہے جو گلی کوچوں میں بولی جاتی ہے، اسی لیے ان کے اشعار لوگوں میں زبان زد عام ہو گئے۔ میر کا لہجہ بے تکلف اور بول چال کا ہے، جس کی وجہ سے ان کی غزلیں قریب، جانی پہچانی اور اپنے ماحول جیسی محسوس ہوتی ہیں۔

میر کی شاعری کی دوسری بڑی خوبی ان کا مکالماتی انداز ہے۔ ان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں شاعر کسی سے بات کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے مثلاً کبھی بادِ صبا سے، کبھی محبوب سے، اور کبھی خود اپنے دل سے۔ یہ انداز شعر کو جاندار بنا دیتا ہے اور قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اس سے روبرو گفتگو کر رہا ہے۔ اسی طرح میر کے ہاں عام زندگی کے تجربات اور انسانی جذبات کا بیان بہت زیادہ ملتا ہے۔ انہوں نے روزمرہ کے لفظوں اور عام انسان کی ذہنی کیفیتوں کو شعر میں سمو کر اپنی شاعری کو حقیقت کے قریب کر دیا۔

میر کی غزل کا ایک اہم پہلو اس میں پائی جانے والی تشبیہات و استعارات ہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات کو سمجھانے کے لیے سادہ مگر بہت خوبصورت مثالیں استعمال کیں۔ محبوب کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑی کہنا، دنیا کو چمن کہنا، دل کو ٹوٹے ہوئے پیالے سے تشبیہ دینا وغیرہ؛ یہ سب مثالیں میر کے اس فن کی گواہ ہیں کہ وہ کم الفاظ میں گہری اور خوبصورت بات کہہ دیتے ہیں۔ ان کی پیکر تراشی یعنی لفظوں کے ذریعے تصویریں بنانے کی صلاحیت بھی بڑی نمایاں ہے۔ میر کے شعر پڑھ کر بعض اوقات پورا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

میر کی شاعری کی ایک اور قابلِ ذکر خوبی اس کی موسیقیت اور نغمگی ہے۔ وہ ایسے الفاظ اور ایسی بحریں استعمال کرتے ہیں جن سے آواز میں ایک خاص لَے اور ترنم پیدا ہوتا ہے۔ منتخبہ غزل میں بھی 'پتّا پتّا، بوٹا بوٹا' کی تکرارِ لفظی شعر میں ایک خوشگوار موسیقی پیدا کرتی ہے۔ یہی نغمگی میر کے اشعار کو یاد رہنے کے قابل اور دل پر اثر کرنے والا بناتی ہے۔

میر کی غزل کا سب سے گہرا رنگ غم واندوہ کا ہے۔ چونکہ ان کی زندگی دکھوں، محرومیوں اور حالات کی سختیوں میں گزری، اس لیے ان کے کلام میں درد کی ایک مسلسل لہر موجود ہے۔ وہ اپنی زندگی کے غموں کو شاعری میں ڈھالتے ہیں، اسی لیے ان کا دردقاری کے دل تک پہنچتا ہے اور اسے اپنا درد محسوس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں عشق کا غم بھی ہے، زمانے کا غم بھی، اور زندگی کی بے ثباتی پر افسوس بھی۔ ان کی شاعری میں کبھی کبھی ناامیدی اور قنوطیت بھی ملتی ہے، لیکن یہ ناامیدی ان کے ذاتی تجربوں کی وجہ سے ہے۔ یہی پہلو ان کی شاعری کو زیادہ سچا، حقیقی اور اثر انگیز بناتا ہے۔

ان تمام خصوصیات نے میر کی غزل کو اردو ادب کی بنیادوں میں شامل کر دیا ہے۔ میر کی غزل آج بھی اسی محبت اور احترام سے پڑھی جاتی ہے جس محبت سے ان کے زمانے میں سنی جاتی تھی، اور یہی ان کی غزلیہ شاعری کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

1.2.3 منتخبہ غزل کی تشریح

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

شاعر کہتا ہے کہ اس کے عشق اور دکھ کی کیفیت کو پورا باغ جانتا ہے۔ ہر پتّہ، ہر پودا اس کے دل کا حال سمجھتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ محبوب، جو اس ساری حالت کا اصل سبب ہے، وہی بے خبر ہے۔ گویا غیر جاندار چیزیں بھی اس کی تکلیف کو سمجھ رہی ہیں مگر محبوب کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اسے کچھ پتہ نہیں۔ اس میں محبوب کی بے رخی اور عاشق کے درد کا خوبصورت مقابلہ موجود ہے۔

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہرِ گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

محبوب اتنا مغرور ہے کہ چاہے تو کسی کی بات اس کے کان تک بھی نہ پہنچنے دے۔ وہ اپنی خوبصورتی اور اہمیت میں اس قدر کھویا ہوا ہے کہ اسے لگتا ہے چاند اور سورج کی آنکھوں میں بھی اس ہی کا عکس جھلکتا ہے۔ شاعر محبوب کے غرور پر طنز کرتا ہے کہ وہ خود پسندی میں حد سے زیادہ آگے بڑھ چکا ہے۔

آگے اس متکبّر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرورِ خودآرا جانے ہے

شاعر کہتا ہے کہ ہم تو اس مغرور محبوب کے سامنے خدا کو یاد کرتے ہیں، مگر محبوب اپنی خود پسندی میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ جیسے خدا کی موجودگی کو بھی نہیں مانتا۔ یہاں محبوب کا غرور انتہائی درجہ میں دکھایا گیا ہے کہ وہ خود کو سب سے بڑا سمجھ رہا ہے۔

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

عاشق دنیا کا سب سے سادہ دل انسان ہے۔ وہ اپنی جان، سکون، عزت اور سب کچھ قربان کر دیتا ہے مگر پھر بھی اسے نقصان نہیں سمجھتا۔ بلکہ یہ خیال کرتا ہے کہ محبوب کے لیے قربانی کر دینا فائدہ میں ہے۔ یہ شعر عاشق کی سادگی اور عشق کی دیوانگی کی بہترین تصویر ہے۔

چارگری بیماریِ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے

دل کی بیماری (عشق کا درد) کا علاج کرنا محبوبوں کی دنیا میں عام اصول نہیں۔ اگرچہ محبوب خود بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ عاشق تکلیف میں ہے، مگر پھر بھی اس درد کا علاج نہیں کرتا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر عشق میں دل کا درد دور کرنے کا رواج ہوتا تو محبوب بھی اس کی دوا کر سکتا تھا، لیکن محبوبوں کی رسم ہی یہ ہے کہ عاشق کو تڑپایا جائے۔

کیا ہی شکارِ فریبی پر مغرور ہے وہ صیّاد بچہ
طائر اُڑتے ہوا میں سارے اپنے اسارا جانے ہے

محبوب ایک نوخیز شکاری کی طرح ہے جو حسن کے جال سے دلوں کو قید کر لیتا ہے۔ وہ اتنا مغرور ہے کہ اسے لگتا ہے ہوا میں آزاد اڑنے والے پرندے بھی اس کے قابو میں ہیں۔ شاعر نے یہاں محبوب کے ناز و انداز اور عشق میں اس کی گرفتاری پیدا کرنے والی قوت کو کنایہ کے طور پر بیان کیا ہے۔

مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے

محبوب محبت، وفاداری اور مہربانی جیسی اعلیٰ خصوصیات سے بالکل ناواقف ہے۔ مگر طنز، کنایہ اور اشاروں بھری باتیں کرنے میں ماہر ہے۔ شاعر کا مقصد یہ بتانا ہے کہ محبوب صرف دکھانے اور باتیں بنانے پر توجہ دیتا ہے، لیکن اصل محبت کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔

کیا کیا فتنے سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

شاعر کہتا ہے کہ عاشق پہلے ہی عشق کی مصیبتوں سے کمزور اور بے تاب ہو چکا ہے، مگر محبوب اس کے سر پر مزید آزمائشیں ڈال دیتا ہے۔ گویا وہ اس پر رحم کرنے کے بجائے اسے مزید تکلیف دے کر خوش ہوتا ہے۔ اس شعر میں عاشق کی بے بسی اور محبوب کی سخت دلی دونوں ظاہر ہیں۔

رخنوں سے دیوارِ چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارہ جانے ہے

باغ کی دیوار میں پڑے سوراخ محبوب کے چہرے کو چھپانے کی کوشش تو کرتے ہیں، مگر عاشق انہی سوراخوں سے اس کے دیدار کے لیے جھانکتا ہے۔ یعنی عاشق کے لیے محبوب کا چہرہ ایک لمحے کے لیے بھی دیکھ لینا غنیمت ہے۔ یہ شعر عاشق کی بے قراری اور عشق کی شدت کی علامت ہے۔

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اس کے آبِ گوارا جانے ہے

یہ مقطع کا شعر ہے۔ یہ شعر عاشق کے درد اور برداشت کی انتہا بیان کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق کی تلخیوں نے اسے اس قدر عادی کر دیا ہے کہ وہ تلوار کی دھار سے بہنے والے خون کو بھی خوشگوار پانی کی طرح پی سکتا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ عشق کے درد کی شدت کو ظاہر کرنے والا استعارہ ہے۔

1.2.4 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

میر تقی کی یہ غزل عشق، درد، بے قراری اور محبوب کی بے نیازی کا دل کو چھو لینے والا بیان ہے۔ شاعر اپنی داخلی کیفیت کو فطرت، باغ، پتے اور ہوا جیسے سادہ استعاروں کے ذریعے اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر شعر میں دل کی سچائی جھلکتی ہے۔ غزل کا مرکزی موضوع یک طرفہ عشق اور محبوب کی بے توجہی ہے، جس کی وجہ سے عاشق مسلسل دکھ، تڑپ اور بے بسی میں مبتلا نظر آتا ہے۔

غزل کا آغاز اس خیال سے ہوتا ہے کہ عاشق کے غم سے تو پوری فطرت باخبر ہے، مگر محبوب ہی بے خبر اور بے پروا ہے۔ چند اشعار میں میرؔ

محبوب کے غرور، خود پسندی اور بے نیازی کا ذکر کرتے ہیں، جبکہ ساتھ ہی عاشق کی سادگی، اخلاص اور نادانی بھی نمایاں ہوتی ہے۔ عاشق کی کیفیت یہ ہے کہ اپنے نقصان کو بھی محبت کا فائدہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ غزل کے کئی اشعار میں محبوب کے ستم، اس کے فریب بھرے ناز و انداز، اور عاشق کی مسلسل اذیت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ محبوب کا طنز و اشاروں میں بات کرنا، عاشق کو تڑپانا اور اسے بے بس دیکھ کر بھی بے رحمی سے چپ رہنا؛ یہ سب میرؔ نے نہایت سادگی اور اثر انگیزی سے بیان کیا ہے۔ غزل کے آخر میں شاعر اپنی حالت کا نقشہ یوں کھینچتا ہے کہ اب وہ درد سہنے کا عادی ہو چکا ہے؛ یہاں تک کہ تلوار کی دھار پر بہنے والا خون بھی اسے گوارا محسوس ہوتا ہے۔ یہ عشق کے غم کی حد درجہ شدت اور عاشق کی بے چارگی کا مؤثر اظہار ہے۔ مختصراً، یہ غزل میر کے دردمند دل، سادگی، گہری جذبیت اور نفیس شاعرانہ اسلوب کی بہترین مثال ہے، جو اردو غزل کے کلاسیکی حسن کو پوری شان کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

ایک جملے میں جواب دیجیے۔

1۔ میر تقی میر کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2۔ میر تقی میر کے اردو دیوان کتنے ہیں؟
3۔ میر تقی میر کی چند مثنویوں کے نام بتائیے۔
4۔ مرزا غالب کی تاریخ ولادت بتائیے۔
5۔ مرزا غالب کا اصل نام اور تخلص تحریر کیجیے۔

1.2.5 منتخب غزل II

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

1.2.6 منتخبہ غزل کی تشریح

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس شعر میں شاعر اپنے دل سے سوال تو کرتا ہے، لیکن یہ سوال عام تجسس نہیں بلکہ ڈانٹ اور ملامت کے انداز میں ہے۔ دل کو ناداں کہہ کر وہ اسے جھنجھوڑ رہا ہے کہ آخر کیسی ضد اور کیسا جنون ہے جس نے اسے بے چین کر رکھا ہے۔ گویا شاعر کہتا ہے: اے دل، کب تک اس بے فائدہ درد میں پڑا رہے گا؟ تو آخر کون سا زخم پال بیٹھا ہے جس کا علاج بھی نظر نہیں آتا؟ یہاں عاشق اپنے ہی دل سے خفگی اور طنز کے ساتھ گفتگو کرتا ہے کہ آخر تجھے کیا ہو گیا ہے جو مسلسل بے چینی میں جلتا ہے۔ یہ درد ایسا ہے جس کی دوا بھی سمجھ نہیں آتی۔ یعنی عشق کی تکلیف کی نہ وجہ معلوم ہے نہ اس کا علاج۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

دوسرے مصرعے کا انداز محض حیرت پر مشتمل نہیں بلکہ استہزاء اور طنز لیے ہوئے ہے۔ شاعر محبوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم تو شدتِ خواہش میں جل رہے ہیں اور وہ ہے کہ ہماری چاہت سے ہی اکتا گیا ہے۔ یہ عجیب الٹی دنیا ہے۔ اس شعر میں لفظ ''یا الٰہی'' میں روحانی حیرت کم اور طنزیہ تعجب زیادہ ہے۔ شاعر محبوب کی نخرہ بازی پر ہنس بھی رہا ہے اور جل بھی رہا ہے اور اسی حال میں وہ خدا سے پوچھتا ہے کہ یہ کیسا عجیب کھیل ہے کہ ہم طلب میں جل رہے ہیں اور وہ اکتاہٹ میں دور بھاگ رہا ہے۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں ''بھی'' کا لفظ معنی کو مزید گہرا کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تم دوسروں سے تو باتیں پوچھتے پھرتے ہو، ان کے حال جاننے میں دلچسپی لیتے ہو، لیکن میں جو تم سے کہیں زیادہ قریب ہوں، میرا حال جاننے کی کبھی زحمت نہیں کرتے۔ مجھے بھی خدا نے زبان دی ہے، میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں، مگر تم پوچھو تو سہی کہ میری چاہت اور میری تکلیف کا مدعا کیا ہے۔ شعر محبوب کی بے نیازی اور عاشق کی محرومی دونوں کو نمایاں کرتا ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہاں شاعر فلسفیانہ حیرت میں ڈوبا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے خدا، جب اصل حقیقت تو ہی ہے اور تیرے سوا کوئی وجود حقیقی نہیں رکھتا، تو پھر یہ دنیا کا شور، اس کی دوڑ دھوپ، اس کے ظاہری نقش و نگار کس معنی میں ہیں؟ یہ سوال دراصل وجودی اشکال ہے: جب بنیاد محض ایک ہے، تو یہ سب ظاہری رنگ کس لیے ہیں؟ اس میں ایک طرح کی فریاد بھی ہے اور روحانی اضطراب بھی۔

اس شعر کے بعد آنے والے تین اشعار معنیاتی تسلسل رکھتے ہیں۔ ان اشعار کو قطعہ کہتے ہیں۔ پہلے یہ اشعار پڑھیں پھر ان کی تشریح:

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ تین اشعار ایک تسلسل رکھتے ہیں۔ معنوی سطح پر دیکھیں تو یہ پورا قطعہ ایک فریاد ہے۔ شاعر دنیا کی رنگینیوں، حسن کی دل فریبی، فطرت کی دلکشی، اور انسان و کائنات کی کشش سے عاجز آ کر شکوہ کرتا ہے کہ ان حسین ہنگاموں میں دل کو اللہ کی طرف پوری توجہ کے ساتھ موڑنا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ کہتا ہے: اے خدا، جب دنیا میں اتنے خوبصورت چہرے، اتنی ناز بردار چالیں، اتنی خوشبودار زلفیں، اتنی جادو اثر نگاہیں اور اتنی دلفریب فطرت موجود ہے، تو پھر دل کیسے ان سے بے نیاز رہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ ان سب کو ہیچ سمجھ کر مطمئن ہو جائیں، روحانی سکون پائیں، مگر یہ رنگینی اور مہک دل کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دنیا کا یہ حسن سراب کی طرح بہالے جاتا ہے اور انسان اصل حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔ یہ فریاد دراصل نفس کے اضطراب اور دنیا کی آزمائشوں کا بیان ہے۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

شاعر اعتراف کرتا ہے کہ محبوب کم سنی یا نادانی کے باعث وفا کا مفہوم بھی نہیں جانتا، اور میں ہوں کہ اسی سے وفا کی امید لگائے بیٹھا ہوں۔ گویا دونوں اپنی اپنی جگہ نادان ہیں: محبوب نادان اس لیے کہ وفا کی حقیقت سے آشنا نہیں، اور عاشق نادان اس لیے کہ وہ ایسے شخص سے وفا چاہتا ہے جو اس کے لائق ہی نہیں۔ شعر میں طنز، خود ترسی اور بے بسی تینوں ملے ہوئے ہیں۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

یہاں شاعر اپنے یا کسی اور کے قول کو دہرا کر کہتا ہے کہ یہ بات تو سچ ہے، کیا شک، کہ جو بھلا کرے گا اس کا بھلا ہوگا۔ یہی درویشوں کی صدا ہے۔ یعنی نیکی ہمیشہ اپنے انجام کے لحاظ سے اچھی ہی ہوتی ہے۔ کبھی نہ کبھی اس کے ثمرات ملتے ہی ہیں۔ شاعر اس اصول کی صداقت کو

مکمل طور پر قبول کرتا ہے۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جو زبانی دعائیں دیتا پھروں اور دل میں کچھ اور ہو۔ میرا طریق سادہ ہے: میں تو اپنی جان تک تم پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔ دعا یا رسمی محبت میرے بس کی بات نہیں، عشق میرے لیے عمل ہے، لفظ نہیں۔ یہاں عاشق کی اخلاص بھری سادگی اور شدتِ عشق دونوں ظاہر ہیں۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

یہ شعر شوخی، فقرہ بازی اور مزاح کا حسین امتزاج ہے۔ شاعر کہتا ہے: مان لیتا ہوں کہ میں کچھ نہیں، لیکن اگر کسی کو بغیر قیمت، بغیر محنت کچھ مل جائے تو اس میں کیا برائی ہے؟ یعنی اگر میں مفت کا غلام بن کر مل جاؤں تو کیا حرج ہے؟ یہاں شاعر خود کو کم تر بھی ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی محبوب کو چھیڑتا بھی ہے کہ مفت کی چیز بری کیوں لگے؟

1.2.7 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

مرزا غالب کی یہ غزل عشق، فلسفے اور انسانی فطرت کے اندر چھپے اضطراب کا ایک مرقع ہے۔ غزل کا آغاز ہی دل کی ملامت سے ہوتا ہے، جہاں شاعر سادہ سوال کی جگہ ناراضی اور جھنجھلاہٹ سے کام لیتا ہے اور اپنے ہی دل سے پوچھتا ہے کہ اس پر کیا گزری ہے۔ آگے چل کر شاعر محبوب کی بے رخی اور اپنی اشتعال انگیز محبت کے مقابل عدم توازن کو طنز، استہزاء اور تعجب میں سمیٹ لیتا ہے۔ وہ محبوب کی بے نیازی کو محض ایک رویہ نہیں بلکہ ایک مضحکہ خیز نکھرا ہوا تماشا سمجھتا ہے، اور اسی لیے 'یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے' جیسے الفاظ میں طنزیہ جھنجلاہٹ گھل جاتی ہے۔ شاعر کے لیے دنیا کی محبت، انسانی تعلقات اور باہمی توقعات سب ایک طرح کی کج روی کا آئینہ ہیں، جن میں عاشق اور محبوب دونوں اپنے اپنے مقام پر نادان دکھائی دیتے ہیں۔

غزل کا درمیانی حصہ غالب کے کلام کا وہ حسین موڑ ہے جہاں عشق کی چھوٹے دائرے سے نکل کر کائنات کا بڑا منظر سامنے آتا ہے۔ دنیا کا حسن، انسان کی جسمانی و روحانی کشش، فطرت کی رنگینیاں، اور ظاہری دلکشی کے بے شمار اشارے شاعر کے دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہاں شاعر کی فریاد صرف ایک محبوب تک محدود نہیں رہتی بلکہ دنیا کی پوری چمک دھمک اس کے اضطراب کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ چاہتا تو یہ ہے کہ دل مطمئن ہو کر ابدی حقیقت کی طرف جھک جائے، مگر دنیا کا رنگا رنگ ہنگامہ اس کی توجہ کو منتشر کر دیتا ہے۔ یہی کیفیت پوری انسانیت کا مسئلہ ہے، اور غالب اسے فنی نزاکت سے بیان کر دیتے ہیں۔

غزل کے آخری حصے میں غالب کا مخصوص طنز، شوخی اور خود آگاہی پھر سے نمایاں ہوتی ہے۔ وہ وفا کی امید ایسے شخص سے رکھتا ہے جو وفا کو جانتا ہی نہیں، نیکی کے اصول کو سچ مانتا ہے، عشق میں دعا کے رسمی پن کو چھوڑ کر اخلاص کی شدت پر قائم رہتا ہے، اور آخر میں ایک شوخ جملہ کہہ کر ساری سنجیدگی کو ایک لطیف مسکراہٹ میں بدل دیتا ہے۔ اس انجام میں نہ صرف غالب کی ہلکی پھلکی طبیعت جھلکتی ہے بلکہ اس بات کا شعوری اعتراف بھی موجود ہے کہ زندگی کے دکھوں، دنیا کے فریب اور عشق کی بے قراری کے باوجود وہ اپنی ذات پر ہنسنے کی صلاحیت نہیں کھوتا۔

مجموعی طور پر یہ غزل عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی، دنیا کی آزمائش، انسانی کمزوری اور شاعر کی ہنسی میں لپٹی ہوئی سنجیدگی کا حسین میل ہے۔ اس میں سوال بھی ہیں، شکایت بھی، فریاد بھی، اور ہنسی میں ڈھلا ہوا تجربہ بھی۔ غالب نے محبت، فطرت، کائنات اور انسان کے باہمی تعلق کو جس صفائی اور نزاکت سے بیان کیا ہے وہ ان کی شعری عظمت اور نفسیاتی گہرائی دونوں کا ثبوت ہے۔ یہ غزل دل کا آئینہ بھی ہے، اور دنیا کا نقشہ بھی۔

1.2.8 زبان کی مہارتیں

میر کی مذکورہ غزل انتہائی معروف ہے جسے مختلف گلوکاروں نے اپنی آواز میں گایا بھی ہے۔فلم ایک نظر میں اس کا پہلا شعر لتا منگیشکر اور محمد رفیع کی آواز میں شامل ہے جبکہ گلزار نے مرزا غالب سیریل میں بھی اس غزل کے چند اشعار نود سہگل کی آواز میں شامل کیے ہیں۔آپ ان اشعار کو یوٹیوب پر سن سکتے ہیں۔ یہ غزل صرف معنی کے اعتبار سے اہم نہیں بلکہ زبان سیکھنے کے لیے بھی ایک بہترین مثال ہے۔اس میں لفظوں کی موسیقیت ، جملوں کا بہاؤ اور مرکب تراکیب کی کثرت، زبان کے سیکھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ یہ غزل بہت مترنم ہے، یعنی روانی اور موسیقی رکھتی ہے۔مصرعوں کے آخر میں آنے والی آوازیں بار بار دہرائی گئی ہیں، جس سے ردیف اور قافیہ کا تسلسل صاف سنائی دیتا ہے۔'پتا پتا، بوٹا بوٹا' جیسی صوتی تکرار سننے والے کو نغمگی کا احساس دیتی ہے۔ کچھ الفاظ عربی و فارسی اثر رکھتے ہیں، جنہیں سن کر تلفظ سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔

میر کی غزل کا سب سے روشن پہلو کثیر تراکیب کا استعمال ہے۔اس غزل میں کچھ اچھے مرکب الفاظ اور تراکیب جیسے: پتا پتا، بوٹا بوٹا، گوہر گوش، چشمِ مہ وخور، شکارفریبی، مہر و وفا، لطف وعنایت، دیوارِ چمن وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔ان کو دھیان سے پڑھنا چاہیے۔اس غزل میں اضافت کے بھی کئی خوبصورت نمونے موجود ہیں: مثلاً چیزِ دیگر، مرغِ ہوا (ہوا کا پرندہ)، دم دارِ آبِ تیغ، شہرِ حسن وغیرہ۔

اکائی میں شامل غالب کی غزل بھی بہت مشہور ہے۔مرزا غالب کی زندگی پر 1954 میں بنی فلم 'مرزا غالب' میں ثریا اور بھارت بھوشن پر طلعت محمود اور ثریا کی آواز میں یہ غزل فلمائی گئی تھی جس کے لیے غلام محمد نے موسیقی دی تھی۔گلزار کے سیریل 'مرزا غالب' میں اس غزل کو جگجیت سنگھ اور چترا کی آواز میں شامل کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ کئی اور گلوکاروں کی آواز میں یہ غزل یوٹیوب پر موجود ہے۔ جب آپ اس غزل کو سنیں گے تو چند چیزیں فوراً محسوس کریں گے۔ پہلی چیز نغمگی اور روانی ہے۔ غالب کی زبان نرم، بہتی ہوئی اور موسیقیت رکھتی ہے۔اس غزل کے قافیے اور ردیف میں موجود صوتی تکرار سننے والے کے ذہن میں لے اور آہنگ پیدا کرتی ہے۔

اور اگر آپ غزل کی قرأت کر رہے ہیں تو مرکب الفاظ اور تراکیب میں ایک خاص وقار اور ترتیب محسوس کریں گے۔ غالب نے اس غزل میں متعدد تراکیب استعمال کی ہیں جن میں فارسی آمیز تراکیب بھی ہیں۔مثلاً دلِ ناداں (ناداں دل)، شکنِ زلفِ عنبریں (عنبر جیسی زلف کی شکن)، نگہِ چشمِ سرمہ سا (سرمے جیسی آنکھ کی نگاہ)، سبزہ وگل، پری چہرہ لوگ وغیرہ۔ یہ اضافتیں صرف معنی نہیں بناتیں بلکہ موسیقیت بھی پیدا کرتی ہیں۔ غالب کی منتخبہ غزل میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کا درست تلفظ اور ہجے جاننا ضروری ہے۔مثلاً ناداں (آخر میں نون غنہ) ہے، اسے 'نادان' نہیں پڑھنا ہے۔ایک لفظ 'عشوہ' ہے جسے ع پر زیر کے ساتھ پڑھنا ہے۔ یہ غزل سننے میں بہت دلکش ہے۔غزل کو سننے والا محسوس کرتا ہے کہ کوئی دل آہستہ آہستہ اپنی بے قراری کی داستان سنا رہا ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کیجیے۔

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

1.3 الفاظ و معنی

الفاظ	معنی
پتّا، بوٹا	جمادات، پودے، درخت اور باغ کی اشیاء
گل	پھول، استعارہ محبوب کے لیے
گوہرِ گوش	کان
مہ و خور	چاند اور سورج
پتلی کا تارا	آنکھ کی پتلی میں نظر آنے والا عکس
خود آرا	خود کو بڑا سمجھنے والا
زیاں	نقصان
چارگری	علاج
طائر	پرندے
اسارا (اسیر)	قیدی
مہر	محبت
بے تواں	کمزور
رخنے	رکاوٹیں، سوراخ، دراڑیں
تشنۂ خوں	خون کا پیاسا
تلخی کش	تلخی برداشت کرنے والا
آبِ تیغ	تلوار کا پانی یعنی خون
آبِ گوارا	خوشگوار پانی
ناداں	ناسمجھ
مشتاق	چاہنے والا
ماجرا	حال، صورت حال
مدعا	مقصد، کہنا
غمزہ	اشارہ کرتی ہوئی نظر
عشوہ	ناز
شکن	زلف کی خم دار لٹیں
عنبرین	خوشبودار
نگہ چشم	نظر
سرمہ سا	سیاہ اور چمکدار
سبزہ و گل	ہریالی اور پھول
ابر	بادل

1.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔ میر تقی میر 28 مئی 1723 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔

2۔ میر کے چھ اردو دیوان مشہور ہیں۔

3۔ میر کی مثنویوں میں دریائے عشق، جوش عشق، معاملات عشق اور اعجاز عشق نمایاں ہیں۔

4۔ مرزا غالب 27 دسمبر 1797ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔

5۔ مرزا غالب نے پہلے 'اسد' تخلص اختیار کیا، پھر 'غالب' لکھنے لگے۔

II

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

1.5 خلاصہ

اس اکائی میں اردو کی دو اہم غزلوں؛ ایک غالب کی اور ایک میر تقی میر کی کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ دونوں غزلیں عشقیہ جذبات، انسانی احساسات اور دل کی کیفیات کو نہایت سادگی اور گہرائی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ اکائی میں طلبہ کو دونوں شاعروں کی شخصیت، اسلوب اور فنی مہارتوں کا مختصر تعارف بھی شامل ہے۔ منتخبہ غزل میں میر اپنے مخصوص سادہ اور دل کو چھونے والے انداز میں محبت کے کرب کو بیان کرتے ہیں۔ اس غزل میں دل کی دنیا، عشق کی شکستگی اور انسانی احساس کی لطافت نمایاں ہے۔ جبکہ غالب کی غزل میں دل، درد، وفا اور انسانی کمزوری کی کیفیات کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پوری غزل میں طنز، بے بسی اور درد کی ملی جلی کیفیت ملتی ہے۔

اکائی میں علمِ بدیع اور علمِ بیان کی بنیادی باتیں سادہ زبان میں سمجھائی گئی ہیں۔ صنائعِ لفظی اور صنائعِ معنوی کی تعریف اور مثالیں دونوں غزلوں سے دی گئی ہیں تاکہ طلبہ شعری صنعتوں کو عملی طور پر پہچان سکیں۔ اس کے بعد قواعدِ زبان جیسے اسم، ضمیر، صفت، فعل، فاعل، مفعول کی تعریف اور ان کی اشعار و جملوں سے مثالیں شامل کی گئی ہیں۔ اس طرح طلبہ نہ صرف غزل کے معنی و مفہوم کو سمجھتے ہیں بلکہ زبان کے بنیادی اجزاء کی پہچان بھی سیکھتے ہیں۔

آخر میں اکائی میں خود اکتسابی کے لیے مختلف نوعیت کی مشقیں شامل کی گئی ہیں۔ ان مشقوں میں اشعار سے تشبیہ، استعارہ، محاورہ، فاعل و مفعول، اور دیگر قواعد کی شناخت کرنے کی سرگرمیاں دی گئی ہیں تاکہ طلبہ اپنی سمجھ کو خود آزمائیں اور زبان دانی میں مزید بہتری لائیں۔ آسان جملوں اور منتخب اشعار کے ذریعے سیکھنے کا عمل دلچسپ اور قابلِ عمل بنایا گیا ہے۔

1.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں:

درست تلفظ کی نشاندہی کیجیے

نیچے دیے گئے الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھیں اور لکھیں:

ناداں

عشوہ

گوہرِ گوش

چشمِ مہ وخور

مغرورِ خود آرا

شہرِ حسن

دم دار آبِ تیغ

سبزہ وگل

پری چہرہ

غلط اور درست املا میں فرق کیجیے

درست صورت منتخب کریں:

(نادان/نعداں)

(معشوق/ماشوق)

(عشوہ/اشوہ)

(مغرور/مغرورہ)

(غزل/غزلہ)

(وفا/وفاہ)

اضافت کی مشق

درج ذیل تراکیب میں اضافت کی نشاندہی کیجیے:

گوہرِ گوش

چشمِ مہ وخور

شہرِ حسن

بیماریِ دل

شکارِ فریبی

دیوارِ چمن

دلِ ناداں
شکنِ زلفِ عنبریں

اضافت لگا کر درست ترکیب بنائیے:

دل+ ناداں
شہر+حسن
زلف+عنبریں
چشم+سرمہ سا
آب+تیغ
دیوار+چمن
بیماری+دل
رنگ+بہار

شعر کی لسانی مشق

درج ذیل اشعار میں ردیف اور قافیہ کی نشاندہی کیجیے:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

درج ذیل اشعار میں موجود اضافت والی تراکیب الگ کیجیے:

چارہ گری بیماریِ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں
لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہرِ گوش کو بالے تک
شکنِ زلفِ عنبریں کیا ہے

درج ذیل مصرعوں کو سادہ نثر میں لکھیے:

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جان تم پر نثار کرتا ہوں

کام کا تجربہ

اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیجیے:

1۔ میر کی شاعری میں سادگی پائی جاتی ہے۔

2۔ غالب مشکل خیالات کو خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔

3۔ میر کے ہاں درد اور غم کا اظہار زیادہ ہے۔

4۔ غالب کی غزل میں فلسفیانہ انداز ملتا ہے۔

5۔ دونوں شاعروں نے عشق پر شعر کہے ہیں۔

6۔ میر کی زبان آسان اور سادہ ہے۔

7۔ غالب کے اشعار میں گہری فکر ہوتی ہے۔

8۔ میر نے انسانی جذبات کو بیان کیا ہے۔

9۔ غالب کا کلام آج بھی مقبول ہے۔

10۔ میر اور غالب اردو غزل کے بڑے شاعر ہیں۔

1.7 مشقی سوالات

1۔ میر تقی میر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ اکائی میں شامل میر کی غزل کا مجموعی تاثر بیان کیجیے۔

3۔ مرزا غالب کا تعارف پیش کیجیے۔

4۔ اکائی میں شامل مرزا غالب کی غزل کا مجموعی تاثر پیش کیجیے۔

1.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

1

2

3

اکائی 2 : مومن اور داغ کی غزلیں

ساخت

2.0 مقاصد

2.1 تمہید

2.2 موضوع کی وضاحت

2.2.1 غزل1 ٹھانی تھی دل میں اب نہ کسی سے ملیں گے ہم

2.2.2 مومن کی غزل کی بنیادی خصوصیات

2.2.3 غزل کی تشریح

2.2.4 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

2.2.5 غزلII غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا

2.2.6 مومن کی غزل کی بنیادی خصوصیات

2.2.7 غزل کی تشریح

2.2.8 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

2.2.9 علم بیان

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

2.3 الفاظ اور معنی

2.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

2.5 خلاصہ

2.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں

کام کا تجربہ

2.6 مشقی سوالات

2.7 مزید مطالعے کے لیے کتب

2.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔۔۔۔

2.1 تمہید

حکیم مومن خاں مومن اردو کے صفِ اوّل کے غزل گوشعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو غزل کی شہرت اور مقبولیت میں ان کا کردار نہایت اہم ہے۔ انہوں نے غزل کو اس کے اصل مزاج میں برتتے ہوئے داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج پیش کیا اور اپنے منفرد اسلوب کے باعث ایسی بلندی حاصل کی کہ مرزا غالب جیسے عظیم شاعر نے ان کے ایک شعر پر اپنا دیوان قربان کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اگرچہ مومن نے قصیدہ اور مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی، مگر ان کی اصل پہچان غزل ہے جس میں وہ اپنی طرز کے واحد شاعر نظر آتے ہیں۔

مومن خاں کا اصل نام محمد مومن تھا۔ وہ 1801ء میں دہلی کے کوچہ چیلان میں ایک کشمیری اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ عربی کی تعلیم شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی اور فارسی میں بھی مہارت پیدا کی۔ اس کے علاوہ طب، نجوم، ریاضی، موسیقی اور شطرنج سے بھی شغف رکھتے تھے۔ جوانی ہی میں شاعری شروع کی اور شاہ نصیر سے اصلاح لی، مگر جلد ہی اپنی انفرادیت کے سبب دہلی کے ممتاز شاعروں میں شمار ہونے لگے۔

مومن کی زندگی اور شاعری پر ان کی رنگین مزاجی اور مذہبیت دونوں کا گہرا اثر ہے۔ ان کی شاعری میں عشق ایک جیتی جاگتی حقیقت کے طور پر جلوہ گر ہوتا ہے، جس میں خلوص، سچائی اور جذبات کی شدت نمایاں ہے۔ ان کے یہاں شانِ استغناء بھی نمایاں ہے؛ انہوں نے مال و زر کی خاطر قصیدے نہیں کہے اور نہ ہی درباروں یا ملازمتوں کی خواہش رکھی۔ ادبی اعتبار سے مومن کی عظمت کا اصل دارومدار ان کی غزل پر ہے۔ ان کی غزل تغزل کی شوخی، شگفتگی، رمزیت اور تہذیبی وقار کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے پرانے مضامین کو نئے تخیل اور نرالے اندازِ بیان سے تازگی بخشی اور یہی خصوصیات مومن خاں مومن کو اردو غزل کا ایک اہم اور ممتاز شاعر بناتی ہیں۔

داغ دہلوی اردو غزل کے نامور اور مقبول شاعر ہیں۔ ان کا اصل نام نواب مرزا خاں تھا اور وہ 25 مئی 1831ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ داغ کا تعلق ایک معزز اور ادبی ذوق رکھنے والے خاندان سے تھا۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں فرخ آبادی انگریزوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، جس کے بعد داغ کی پرورش نواب وزیر خاں م کی سرپرستی میں ہوئی۔ داغ کو بچپن ہی سے اچھا ادبی ماحول ملا اور انہوں نے اس دور کے بڑے اساتذہ، خصوصاً شیخ ابراہیم ذوق، سے شاعری کی اصلاح لی۔

1857ء کے بعد داغ دہلی سے لکھنؤ چلے گئے، جہاں نواب واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ بعد میں وہ حیدرآباد (دکن) منتقل ہوئے اور نظامِ دکن کے دربار میں صدرالصدور کی حیثیت سے رہے۔ داغ نے درباری زندگی گزاری لیکن ان کی شاعری درباری تصنع سے پاک اور عوامی رنگ لیے ہوئے ہے۔

داغؔ کی شاعری کا اصل میدان غزل ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت سہلِ ممتنع، شستہ زبان، برجستہ محاورہ اور روزمرہ کی دل کش پیش کش ہے۔ انہوں نے عشق و محبت کے جذبات کو نہایت سادہ، رواں اور فطری انداز میں بیان کیا۔ داغ کے اشعار میں تصنع، فلسفیانہ پیچیدگی یا معنوی ابہام کم اور جذباتی سچائی، شوخی، نازک خیالی اور دل آویزی زیادہ نظر آتی ہے۔ اسی بنا پر ان کا کلام سننے اور پڑھنے والے پر فوراً اثر کرتا ہے۔

داغ کے دیوانوں میں گلزارِ داغ، فریادِ داغ اور یادگارِ داغ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کا شمار اردو کے ان استاد شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے زبان و بیان کی روایت کو مضبوط کیا اور غزل کو عام قاری کے دل کے قریب پہنچایا۔ داغ دہلوی کا انتقال 17 مارچ 1905ء کو حیدرآباد میں ہوا۔

اس اکائی میں ہم ان دونوں ہی اہم شاعروں کی غزل گوئی کی بنیادی خصوصیات و انفرادیت پر مختصراً بات کریں گے اور پھر ان کی منتخب غزل کے اشعار کے معانی و مفاہیم سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

2.2 موضوع کی وضاحت

2.2.1 غزلI

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

اس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجوم شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

بے روئے مثل ابر نہ نکلا غبار دل
کہتے تھے ان کو برق تبسم ہنسی سے ہم

ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خار راہ غیر
کیوں کر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصل گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھا
بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم

ہے چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے
ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم

وحشت ہے عشق پردہ نشیں میں دم بکا
منہ ڈھانکتے ہیں پردۂ چشم پری سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومنؔ نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

2.2.2 مومن کی غزل کی بنیادی خصوصیات

محمد مومن خاں مومنؔ انیسویں صدی کے ان اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اردو غزل کو نئی آب و تاب اور انفرادیت حاصل ہوئی۔ ان کا تعلق دبستانِ دہلی سے تھا اور ان کا اصل میدانِ فن غزل گوئی ہے۔ اگر چہ انہوں نے قصیدہ، مثنوی، رباعی اور قطعہ میں بھی طبع آزمائی کی، لیکن ان کی شہرت اور عظمت کا دارومدار ان کی غزلوں پر ہے۔ مومنؔ بعض نقادوں کے نزدیک عہدِ زرّیں کے دوسرے بڑے غزل گو سمجھے جاتے ہیں۔

مومنؔ کی غزل کا بنیادی دائرہ حسن و عشق ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو اسی موضوع کے گرد استوار کیا، مگر اس محدود دائرے میں بھی جدت، تنوع اور تازگی پیدا کی۔ عشق کے چھوٹے چھوٹے واقعات، ہجر و وصال کی کیفیات، محبوب کی نازک ادائیں اور عاشق کے جذبات کو انہوں نے نہایت سلیقے اور فنی شعور کے ساتھ بیان کیا، جس سے یکسانیت پیدا نہیں ہونے پاتی۔ مومنؔ کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی شاعری میں ذاتی تجربات کی شمولیت ہے۔ ان کی غزلیں محض روایتی عشقیہ مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ سچی وارداتِ قلب کا اظہار ہیں۔ یہی صداقت، خلوص اور اصلیت ان کے کلام کو اثر انگیز اور دل نشیں بناتی ہے۔

مومنؔ نازک خیال شاعر ہیں۔ ان کے یہاں مضمون آفرینی، باریک بینی اور حسنِ تعلیل کی خوب صورت مثالیں ملتی ہیں۔ وہ معمولی بات کو بھی لطیف تخیل اور فنی مہارت سے غیر معمولی بنا دیتے ہیں، جس سے ان کی غزل میں نزاکت اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔ مومنؔ نے اردو غزل میں مکرِ شاعرانہ کو خاص انداز میں برتا۔ وہ محبوب سے بظاہر اس کے فائدے کی بات کہتے ہیں، مگر درحقیقت اس میں اپنا مفاد پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ اسلوب ان کی غزل کو ذہانت، شوخی اور لطافت عطا کرتا ہے۔ مومنؔ کے یہاں ایہام بھی ایک اہم فنی وسیلہ ہے۔ بعض مقامات پر ایہام ان کی شاعری میں حسن اور معنوی تہہ داری پیدا کرتا ہے، اگر چہ کہیں کہیں یہی وصف عیب بھی بن جاتا ہے، مگر مجموعی طور پر ان کے کلام کو دل چسپی عطا کرتا ہے۔ مومنؔ کی غزلوں میں معاملہ بندی نمایاں ہے۔ وہ محبوب سے اپنے دل کی بات کھل کر کہتے ہیں، رقیب، ہجر و وصال اور عاشقانہ چھیڑ چھاڑ کا بیان سادگی اور سچائی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عریانیت نہیں بلکہ تہذیب اور شائستگی ملتی ہے۔

مومنؔ کی غزلوں میں تغزل کا عنصر نہایت مضبوط ہے۔ چونکہ انہیں موسیقی سے خاص شغف تھا، اس لیے ان کے اشعار میں نغمگی، روانی اور لے کا حسن نمایاں ہے۔ ساتھ ہی معنویت، گہرائی اور تہہ داری بھی موجود ہے۔ مومنؔ نے اپنے تخلص کو بڑی فنی مہارت سے برتا۔ کہا جاتا ہے کہ اردو شاعری میں شاید ہی کسی شاعر نے اپنے تخلص سے اتنا خوب صورت اور بامعنی کام لیا ہو جتنا مومنؔ نے لیا ہے۔ مومنؔ کی غزل کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ان کا اسلوب ہے۔ وہ عام اور سادہ بات کو بھی نہایت خوب صورت، دل نشیں اور اثر دار انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اشارہ، کنایہ، نئی ترکیبیں اور لفظی الٹ پھیر ان کے اسلوب کو نکھار دیتے ہیں۔ مومنؔ کے کلام میں شوخی، ظرافت اور نرم و لطیف طنز بھی ملتا ہے۔ ان کا طنز زہریلا یا تلخ نہیں بلکہ مسکراہٹ اور نزاکت لیے ہوتا ہے، جو قاری کو لطف اور معنوی گہرائی دونوں عطا کرتا ہے۔

غرض مومنؔ کی غزل گوئی حسنِ احساس، صداقتِ تجربہ، فنی چابک دستی، زبان کی صفائی اور اسلوب کی انفرادیت کا حسین امتزاج ہے۔

2.2.3 منتخبہ غزل کی تشریح

یہ غزل مومن کی غزل گوئی کی نمایاں مثال ہے جس میں عشق کی مجبوری، عاشق کی بے بسی، خودداری، داخلی کشمکش اور طنزِ لطیف سب کچھ یکجا ہو گیا ہے۔ شاعر نے عاشق کے نفسیاتی حالات کو نہایت سچائی اور فنی مہارت سے بیان کیا ہے۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ میں نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب کسی سے ملاقات نہیں کروں گا، مگر کیا کیا جائے کہ دل کی کمزوری اور جی کی بے قراری نے مجھے مجبور کر دیا۔ یہاں عشق کی بے اختیاری اور دل کی ناتوانی نمایاں ہے۔

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

جب شاعر محبوب کو کسی اور کے ساتھ ہنستے ہوئے دیکھتا ہے تو شدید بے بسی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور محض منہ دیکھ کر رہ جاتا ہے، آنسو بہاتا ہے۔ یہ حسد، محرومی اور بے چارگی کی کیفیت کا بیان ہے۔

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

شاعر محبوب سے شکوہ آمیز انداز میں کہتا ہے کہ ہم سے مت پوچھو کہ تمہارے اس عمل کو کیا کہیں، خود ہی انصاف کرو اور اپنے دل سے پوچھو کہ یہ سلوک درست ہے یا نہیں۔ یہ طنز اور شکوہ دونوں کا امتزاج ہے۔

بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

اگر ہم زندگی سے اس قدر بیزار نہ ہوتے تو تمہاری شکایت لے کر کسی گواہ کے سامنے فریاد کرتے۔ یہاں عاشق کی بے نیازی، تھکن اور دل شکستگی جھلکتی ہے۔

اس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجوم شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ اے شوق کے ہجوم! میں تو اس پر مر ہی جاؤں گا، آج اپنی بے طاقتی کے باوجود عشق کے جذبے کو اور زور سے آزما رہا ہوں۔ اس شعر عشق کی شدت اور خود سپردگی کا اظہار ہے۔

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

محبوب (صاحب) نے اپنے غلام (عاشق) کو آزاد کر دیا، یعنی بے رخی اختیار کی۔ شاعر طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ لو، اب تو ہم بندگی سے بھی چھوٹ گئے۔ یہاں ترکِ تعلق کو آزادی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

بے روئے مثل ابر نہ نکلا غبار دل
کہتے تھے ان کو برق تبسم ہنسی سے ہم

دل کا غبار آنسوؤں کے بغیر ایسے نہ نکل سکا جیسے بادل کے بغیر گرد نہیں بیٹھتی۔ ہم تو محبوب کی ہنسی کو بجلی کی چمک کہا کرتے تھے۔ یہاں تشبیہ، استعارہ اور حسرت کا امتزاج ہے۔

ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خار راہ غیر
کیوں کر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

ہماری ناتوانی کے باوجود ہم غیروں کے لیے کانٹے کی طرح تھے، تو پھر کیوں نہ ہمیں محبوب کی گلی سے نکال دیا جاتا؟ یہاں عاشق کی بے قدری اور سماجی تنہائی کا احساس ہے۔

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصل گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ ابھی تو موسمِ بہار بہت دور ہے، نہ جانے کیا نتیجہ نکلے گا، مگر ہم ابھی سے دشت (ویرانی) کی طرف بھاگنے لگے ہیں۔ یہ ناامیدی اور پیشگی شکست کا اظہار ہے۔

منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھا
بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم

آئینہ (دل) پہلے ہی صاف نہیں تھا، تو اب بلاوجہ اس پر مزید گرد کیوں ڈالیں؟ یعنی حقیقت پہلے ہی تلخ ہے، خودفریبی کی ضرورت نہیں۔

ہے چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے
ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم

غیروں کے سامنے محبوب کا چھیڑ چھاڑ کرنا ایسا ہے کہ ہنسی کی جگہ آنسو نکل آئیں۔ یہاں غیرت، حسد اور دل آزاری کا بیان ہے۔

وحشت ہے عشق پردہ نشیں میں دم بکا
منہ ڈھانکتے ہیں پردۂ چشم پری سے ہم

پردہ نشیں محبوب سے عشق ایسی وحشت پیدا کرتا ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے، اس لیے ہم اپنی آنکھوں کے پردے سے منہ ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہ عشق کی گھٹن اور ضبط کی علامت ہے۔

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

شاعر حیران ہے کہ کیا دل کسی اجنبی آشنا کے ہاتھ چلا گیا ہے، کہ اب ہم خود اپنے آپ کو بھی اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ یہ خود سے بیگانگی کا اظہار ہے۔

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومنؔ نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مومن کہتے ہیں کہ اگر خواہش کا نام بھی لیں تو دل نکال کر رکھ دیں، مگر ہم ایسے نہیں کہ کسی بدعتی (نااہل یا بےوفا محبوب) سے تعلق رکھیں۔ یہ خودداری، استغناء اور انا کا اعلان ہے۔

2.2.4 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

مومن کی یہ غزل اردو غزل کی روایت میں عشق کی نفسیات، عاشق کی داخلی کشمکش اور خودداری کے شعور کی نہایت گہری اور بامعنی مثال ہے۔ اس غزل کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ عشق محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایک ایسا داخلی تجربہ ہے جو انسان کے دل، عقل، انا اور سماجی وجود سب کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ مومن نے اس تجربے کو نہ کسی تصنع کے ساتھ پیش کیا ہے اور نہ ہی محض روایتی استعارات کے سہارے، بلکہ اپنی ذاتی وارداتِ قلب کو صداقت اور فنی مہارت سے غزل کا قالب عطا کیا ہے۔

اس غزل میں عاشق کی کیفیت مجبوری اور اختیار کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ شاعر بار بار یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ عقل اور ارادے کی سطح پر محبوب سے دور رہنا چاہتا ہے، مگر دل اور جذبہ اس فیصلے کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ یہی بے اختیاری اس غزل کا بنیادی نفسیاتی محور ہے۔ عاشق اپنی کمزوری کا اعتراف بھی کرتا ہے اور اسی کمزوری پر طنزیہ مسکراہٹ بھی بکھیر دیتا ہے، جس سے غزل میں تلخی کے باوجود لطافت باقی رہتی ہے۔ غزل کا ایک اہم مجموعی اثر خودداری اور استغناء ہے۔ مومن کا عاشق نہ تو سراپا گریہ وزاری بن جاتا ہے اور نہ ہی محبوب کے سامنے مکمل سپردگی اختیار کرتا ہے۔ محبوب کی بے رخی، غیروں سے اختلاط اور بے اعتنائی کے باوجود عاشق اپنی انا اور وقار کو مکمل طور پر کھونے نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ شکایت کے باوجود فریاد کم اور طنز زیادہ ہے۔ وہ محبوب سے انصاف کی اپیل کرتا ہے، مگر کسی ثالث یا گواہ کے سامنے دامن نہیں پھیلاتا۔ یہ رویہ مومن کے مخصوص عشقیہ مزاج اور دہلی کی روایتی شرافت کا آئینہ دار ہے۔

اس غزل میں معاملہ بندی پورے عروج پر ہے۔ محبوب، رقیب، ہجر و وصال، حسد، غیرت اور محرومی یہ سب عناصر زندگی کے حقیقی تجربات کی طرح سامنے آتے ہیں۔ عاشق محبوب کو کسی خیالی پیکر کے بجائے ایک جیتی جاگتی انسان کے طور پر دیکھتا ہے، جس کی ہنسی، بے نیازی اور چھیڑ چھاڑ دل کو زخمی کرتی ہے۔ یہی حقیقت پسندی غزل کو جذباتی سچائی عطا کرتی ہے اور قاری کو شاعر کے درد میں شریک کر لیتی ہے۔

غزل کا مجموعی تاثر نفسیاتی گہرائی بھی رکھتا ہے۔ عاشق رفتہ رفتہ خود سے بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے؛ وہ اپنے ہی وجود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت عشق کی اس انتہا کی علامت ہے جہاں انسان اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے باوجود غزل کا اختتام مکمل شکست پر نہیں ہوتا بلکہ ایک باوقار انکار پر ہوتا ہے۔ شاعر اعلان کرتا ہے کہ خواہ آرزو کا نام لینے پر دل نکالنا پڑے، وہ ایسے تعلق کو نبھانے پر آمادہ نہیں جو اس کی خودداری کے خلاف ہو۔

فنی اعتبار سے غزل کا مجموعی تاثر سادگی میں گہرائی، طنز میں درد اور شکایت میں وقار کا حسین امتزاج ہے۔ زبان نہایت رواں، محاورہ شستہ اور اندازِ بیان بے ساختہ ہے۔ مومن نے جذبات کی شدت کو لفظی شور میں تبدیل نہیں ہونے دیا بلکہ ضبط، اشارے اور کنایے کے ذریعے معنی کی تہہ داری پیدا کی ہے۔ غرض یہ غزل مومن کی غزل گوئی کا ایک نمائندہ نمونہ ہے جس میں عشق کی بے بسی کے ساتھ ساتھ عاشق کی انا، شعوری استغناء اور تہذیبی وقار پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

ایک جملے میں جواب دیجیے۔

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

2.2.5 منتخب غزل II

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا

ہنسا ہنسا کے شب وصل اشک بار کیا
تسلیاں مجھے دے دے کے بے قرار کیا

یہ کس نے جلوہ ہمارے سر مزار کیا
کہ دل سے شور اٹھا ہائے بے قرار کیا

نہ آئے راہ پہ وہ عجز بے شمار کیا
شب وصال بھی میں نے تو انتظار کیا

تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا

تڑپ پھر اے دل ناداں کہ غیر کہتے ہیں
اخیر کچھ نہ بنی صبر اختیار کیا
رقیب و شیوۂ الفت خدا کی قدرت ہے
وہ اور عشق بھلا تم نے اعتبار کیا

تری نگہ کے تصور میں ہم نے اے قاتل
لگا لگا کے گلے سے چھری کو پیار کیا

غضب تھی کثرت محفل کہ میں نے دھوکہ میں
ہزار بار رقیبوں کو ہمکنار کیا

ہوا ہے کوئی مگر اس کا چاہنے والا
کہ آسماں نے ترا شیوہ اختیار کیا

نہ پوچھ دل کی حقیقت مگر یہ کہتے ہیں
وہ بے قرار رہے جس نے بے قرار کیا

فسانۂ شب غم ان کو اک کہانی تھی
کچھ اعتبار کیا کچھ نہ اعتبار کیا

کسی کے عشق نہاں میں یہ بد گمانی تھی
کہ ڈرتے ڈرتے خدا پر بھی آشکار کیا

وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہو نہ سکے
ستم کیا تو بڑا تو نے افتخار کیا

بنے گا مہر قیامت بھی ایک خال سیاہ
جو چہرہ داغ سیہ رو نے آشکار کیا

2.2.6 داغ کی غزل کی بنیادی خصوصیات

داغ دہلوی اردو غزل کے اُن استاد شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے غزل کو زبان کی صفائی، سادگی اور عوامی مقبولیت عطا کی۔ داغ کی غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے، مگر یہ عشق نہ فلسفیانہ پیچیدگی رکھتا ہے اور نہ تصوف کی گہرائی۔ یہ زمینی، انسانی اور فطری عشق ہے، جس میں محبوب کی بے رخی، ناز، وعدہ و وعید اور عاشق کی کیفیتیں نہایت سادہ انداز میں بیان ہوئی ہیں۔ ان کے اشعار دل سے نکل کر دل پر اثر کرتے ہیں۔

داغ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی سادہ، رواں اور شستہ زبان ہے۔ انہوں نے مشکل الفاظ، ثقیل ترکیبات اور پیچیدہ تشبیہوں سے گریز کیا اور دہلی کی ٹکسالی بول چال کو شاعری میں برتا۔ ان کی غزلیں محاورۂ اردو کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں غیر معمولی روانی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ اشعار میں ایسی لے اور آہنگ ہوتا ہے کہ وہ آسانی سے یاد ہو جاتے ہیں اور مشاعروں میں بہت مقبول رہے۔ یہی روانی ان کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔ داغ کے کلام میں شوخی اور ظرافت نمایاں ہے، مگر یہ شوخی مہذب اور شائستہ ہے۔ ان کے طنز میں تلخی نہیں بلکہ ہلکی سی چوٹ اور مسکراہٹ ہوتی ہے۔ محبوب سے شکوہ بھی اس انداز میں کرتے ہیں کہ بات دل آویز بن جاتی ہے۔

اگرچہ داغ کا شمار عشقیہ شاعروں میں ہوتا ہے، مگر ان کے یہاں رکاکت اور ابتذال نہیں ملتا۔ وہ نازک اور بعض اوقات جرات مندانہ مضامین بھی تہذیب اور وقار کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جو ان کے فنی توازن کا ثبوت ہے۔ داغ کی غزلوں میں محبوب اور عاشق کے درمیان کے روزمرہ کے معاملات، شکوے، شکایتیں، ناراضی اور مناجات بڑی سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ یہی معاملہ بندی ان کی شاعری کو عام زندگی سے قریب کر دیتی ہے۔ داغ نے جان بوجھ کر مشکل مضامین، ایہام، فلسفیانہ گہرائی اور لفظی صنعتوں سے گریز کیا۔ ان کے نزدیک شاعری کا حسن بات کو آسان اور دل نشیں بنانے میں ہے، نہ کہ اسے الجھا دینے میں۔

داغ بنیادی طور پر مشاعروں کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں سننے اور سنانے کے لیے کہی گئی ہیں۔ برجستگی، برجستہ قوافی اور سادہ مفہوم کی وجہ سے ان کا کلام سامعین کو فوراً متاثر کرتا ہے۔ داغ دہلوی نے دہلی کی کلاسیکی غزل روایت کو مضبوطی سے نبھایا۔ وہ ذوق، مومن اور غالب کے بعد دہلی کی غزل روایت کے آخری بڑے نمائندہ شاعر سمجھے جاتے ہیں، جن کے یہاں زبان و بیان کی روایت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

مجموعی طور پر داغ دہلوی کی غزل گوئی سادگی، روانی، زبان کی شیرینی، شوخی اور عوامی مقبولیت کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو تصنع اور پیچیدگی سے نکال کر عام قاری اور سامع کے دل تک پہنچایا، اور یہی ان کی غزل گوئی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

2.2.7 منتخبہ غزل کی تشریح

داغ کی یہ غزل طویل ہے یہاں اس غزل کے منتخب اشعار پیش کیے گئے ہیں جن کی تشریح ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے وعدے پر یقین کرنا سراسر ظلم تھا۔ پوری رات قیامت کی طرح سخت اور اذیت ناک انتظار میں گزری۔ یہاں وعدہ خلافی کے دکھ اور انتظار کی شدت کو ''قیامت'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا

محبوب (بت) نے کسی طرح بھی عاشق کی بات پر یقین نہ کیا۔ الٹا عاشق کی وفاداری ہی اس کے لیے باعثِ شرمندگی بن گئی۔ یہ عاشق کی بے قدری اور محبوب کی بے اعتنائی کا اظہار ہے۔

ہنسا ہنسا کے شب وصل اشک بار کیا
تسلیاں مجھے دے دے کے بے قرار کیا

شبِ وصال میں محبوب نے ہنستے ہوئے آنسو بہا دیے، یعنی خوشی اور رنج دونوں کا ملا جلا اظہار کیا، مگر تسلیاں دے دے کر عاشق کو مزید بے چین کر دیا۔ یہاں محبوب کی دورخی کیفیت نمایاں ہے۔

یہ کس نے جلوہ ہمارے سر مزار کیا
کہ دل سے شور اٹھا ہائے بے قرار کیا

شاعر حیران ہے کہ قبر پر کس نے جلوہ دکھایا کہ دل میں شدید اضطراب پیدا ہو گیا۔ یہ محبوب کی یاد، تصور یا کسی نئی حسرت کی طرف اشارہ ہے جو دل کو ہلا دیتی ہے۔

نہ آئے راہ پہ وہ عجز بے شمار کیا
شب وصال بھی میں نے تو انتظار کیا

عاشق نے بے حد عاجزی کی، مگر محبوب پھر بھی نہ مانا۔ حتیٰ کہ شبِ وصال بھی انتظار ہی میں گزر گئی۔ یہ عشق کی انتہا درجے کی محرومی کو ظاہر کرتا ہے۔

تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا

محبوب نے عاشق سے دیدار کا وعدہ کیا تھا، مگر اس کے برعکس ساری دنیا کو امیدوار بنا دیا۔ یہاں محبوب کی عام التفاتی اور عاشق کی خاص محرومی واضح ہے۔

تڑپ پھر اے دل ناداں کہ غیر کہتے ہیں
آخر کچھ نہ بنی صبر اختیار کیا

شاعر دل کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے نادان دل! اب پھر تڑپ، کیونکہ صبر کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوا، جیسا کہ غیروں نے کہا تھا۔ یہاں صبر کی ناکامی اور درد کی واپسی کا ذکر ہے۔

رقیب و شیوۂ الفت خدا کی قدرت ہے
وہ اور عشق بھلا تم نے اعتبار کیا

یہ خدا کی قدرت ہے کہ رقیب بھی عشق کے انداز سکھانے لگا ہے۔ شاعر طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ تم نے اس کے عشق پر کیسے یقین کر لیا؟ یہاں رقیب پر طنز ہے۔

تری نگہ کے تصور میں ہم نے اے قاتل
لگا لگا کے گلے سے چھری کو پیار کیا

محبوب کی قاتلانہ نگاہوں کے تصور میں عاشق نے چھری کو گلے سے لگا لگا کر پیار کیا، یعنی جان قربان کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ عشق کی انتہا درجے کی خودسپردگی ہے۔

غضب تھی کثرت محفل کہ میں نے دھوکہ میں
ہزار بار رقیبوں کو ہمکنار کیا

محفل میں اس قدر ہجوم تھا کہ دھوکے میں عاشق نے کئی بار رقیبوں کو گلے لگا لیا۔ یہ حسد، خفت اور سماجی الجھن کا بیان ہے۔

ہوا ہے کوئی مگر اس کا چاہنے والا
کہ آسماں نے ترا شیوہ اختیار کیا

شاعر کہتا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا چاہنے والا ہوا ہو جس کے ساتھ آسمان نے بھی محبوب جیسا سلوک کیا ہو۔ محبوب کی بے وفائی کو قسمت کی بے مہری سے جوڑا گیا ہے۔

نہ پوچھ دل کی حقیقت مگر یہ کہتے ہیں
وہ بے قرار رہے جس نے بے قرار کیا

دل کی کیفیت بیان سے باہر ہے، مگر اتنا ضرور ہے کہ جس نے دوسروں کو بے چین کیا، وہ خود بھی بے چین رہا۔ یہاں انجام کی طرف اشارہ ہے۔

فسانۂ شب غم ان کو اک کہانی تھی
کچھ اعتبار کیا کچھ نہ اعتبار کیا

شبِ غم کی داستان محبوب کے لیے محض ایک کہانی تھی، جس پر اس نے کبھی یقین کیا اور کبھی نہیں۔ یہ محبوب کی بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔

کسی کے عشق نہاں میں یہ بد گمانی تھی
کہ ڈرتے ڈرتے خدا پر بھی آشکار کیا

کسی کے پوشیدہ عشق میں اتنی بدگمانی تھی کہ خوف کے عالم میں وہ بات خدا تک پر ظاہر کر دی گئی۔ یہ عشق کی شدت اور ذہنی اضطراب کی تصویر ہے۔

وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہو نہ سکے
ستم کیا تو بڑا تو نے افتخار کیا

محبوب نے ایسا بڑا ظلم کیا جس کی مثال آسمان بھی نہ دے سکے۔ یہاں ظلم کو طنزیہ انداز میں افتخار کہا گیا ہے۔

بنے گا مہر قیامت بھی ایک خال سیاہ
جو چہرہ داغ سیہ رو نے آشکار کیا

شاعر کہتا ہے کہ داغ کا سیاہ رو چہرہ اتنا نمایاں ہوگا کہ قیامت کا سورج بھی اس کے مقابلے میں ایک سیاہ تل معلوم ہوگا۔ یہ خود کلامی، عاجزی اور انجام کا بیان ہے۔

2.2.8 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

داغ دہلوی کی یہ غزل اردو غزل کی روایت میں عشق کی ناکامی، وعدہ خلافی کے کرب، انتظار کی اذیت اور عاشق کی داخلی ٹوٹ پھوٹ کا

نہایت پُر اثر اور ہمہ گیر مرقع پیش کرتی ہے۔اس غزل کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ عشق ایک ایسا تجربہ ہے جو عاشق کو امید اور یاس، یقین اور بدگمانی، ضبط اور تڑپ کے درمیان مسلسل معلق رکھتا ہے۔داغ نے اس کیفیت کو نہایت سادہ مگر شدید اثر رکھنے والی زبان میں پیش کیا ہے، جس سے قاری خود کو عاشق کے درد میں شریک محسوس کرتا ہے۔

غزل کے آغاز سے آخر تک وعدے پر اعتبار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی رسوائی ایک مرکزی جذبہ بن کر ابھرتی ہے۔ عاشق محبوب پر بھروسا کر کے پوری رات قیامت صفت انتظار میں گزارتا ہے، مگر اس کا صلہ محرومی اور شرمندگی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔یہی احساس اس غزل کو ایک مسلسل نوحہ بنا دیتا ہے، لیکن یہ نوحہ چیخ و پکار کے بجائے ضبط، شکوے اور طنزِ لطیف کے انداز میں سامنے آتا ہے، جو داغؔ کی شاعری کی پہچان ہے۔اس غزل کا مجموعی تاثر بے قراری کی شدت سے تشکیل پاتا ہے۔وصال کی رات بھی انتظار میں بدل جانا، تسلیوں کا بے چینی میں اضافہ کرنا، اور محبوب کے جلوے کا تصور بھی دل میں شور مچا دینا؛ یہ سب عشق کی اس نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں جہاں سکون نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔عاشق نہ جینے کے قابل رہتا ہے نہ مرنے کے، اور یہی معلق کیفیت غزل کو ایک گہرا جذباتی تناؤ عطا کرتی ہے۔

غزل میں رقیب اور محفل کا ذکر عشق کے سماجی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔رقیبوں کی موجودگی، محفل کا ہجوم اور محبوب کی عام التفاتی عاشق کی محرومی کو اور زیادہ نمایاں کر دیتی ہے۔ یہاں عشق صرف دو افراد کا ذاتی معاملہ نہیں رہتا بلکہ سماجی سطح پر بھی عاشق کے لیے ذلت، حسد اور خفت کا سبب بن جاتا ہے۔اس پہلو سے غزل میں زندگی کی ایک تلخ حقیقت جھلکتی ہے۔ایک اہم مجموعی اثر انجام کی طرف اشارہ ہے۔ شاعر یہ احساس دلاتا ہے کہ جو دوسروں کو بے قرار کرتا ہے، وہ خود بھی بے قراری سے نہیں بچ سکتا۔یوں غزل میں محبوب کی بے نیازی کے باوجود ایک اخلاقی توازن قائم ہو جاتا ہے۔عاشق مکمل طور پر شکست خوردہ نہیں بلکہ اپنے دکھ کو شعوری ادراک کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

فنی اعتبار سے اس غزل کا مجموعی تاثر سادگی میں تاثیر، زبان کی شستگی اور جذبات کی صداقت پر قائم ہے۔داغؔ نے نہ فلسفہ باندھا ہے نہ پیچیدہ استعارے گھڑے ہیں، بلکہ عام بول چال کی زبان میں عشق کے انتہائی کربناک تجربے کو بیان کر دیا ہے۔یہی وصف اس غزل کو دل نشیں، یادگار اور دیرپا اثر کا حامل بناتا ہے۔

غرض یہ غزل داغؔ دہلوی کے عشقیہ مزاج، انسانی کمزوریوں کے گہرے شعور اور زبان پر مکمل قدرت کی آئینہ دار ہے، اور اردو غزل میں انتظار اور محرومی کی بہترین ترجمان بن کر سامنے آتی ہے۔

2.2.9 علم بیان

علمِ بیان میں، تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجازِ مرسل وہ اصطلاحات ہیں جو الفاظ کے حقیقی کے بجائے مجازی استعمال سے متعلق ہیں۔تشبیہ میں کسی چیز کو دوسری چیز سے کسی مشترک صفت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیا جاتا ہے، جبکہ استعارہ میں مشبہ (جس کو تشبیہ دی جا رہی ہے) کو حذف کر کے صرف مشبہ بہ (جس سے تشبیہ دی جا رہی ہے) کو استعمال کیا جاتا ہے۔کنایہ میں لفظ کا حقیقی اور مجازی معنی میں کوئی لازمی تعلق ہوتا ہے، اور مجازِ مرسل میں حقیقی معنی کو چھوڑ کر کسی دوسرے معنی کو مراد لیا جاتا ہے جس میں تشبیہ کا تعلق نہ ہو۔آیئے پہلے ان چاروں اصطلاحات کی تعریف ایک بار سمجھ لیں تاکہ آگے آنے والی اکائیوں میں بھی اشعار میں ان کا اطلاق اور تفہیم آسان ہو۔

تشبیہ:

کسی مشترک صفت کی بنیاد پر کسی ایک چیز کو دوسری چیز کی مانند قرار دینا تشبیہ کہلاتا ہے۔خیال رہے کہ اس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں موجود ہوتے ہیں اور ان کے درمیان مشابہت کی وجہ واضح ہوتی ہے۔مثلاً 'حامد شیر کی طرح ہے'۔یہاں 'شیر' سے بہادری کی صفت کی بنیاد پر تشبیہ دی جا رہی ہے یعنی حامد بھی شیر کی طرح بہادر ہے۔یا پھر میر کی غزل کا مشہور شعر ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

استعارہ:

کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی میں استعمال نہ کر کے اس کی جگہ مجازی میں معنی استعمال کرنا اور ان دونوں کے درمیان تشبیہ کا تعلق ہو۔ اس میں مشبہ کو حذف کر کے صرف مشبہ بہ کو استعمال کیا جاتا ہے، یعنی حقیقت میں جو لفظ ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور لفظ کو اس کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے میر کی غزل کا پہلا شعر ہے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے

یہاں پتا پتا بوٹا بوٹا جو کہ عام جمادات ہیں ان کو انسانوں کا روپ دیا گیا ہے کہ وہ ہمارا درد و غم سمجھ رہے ہیں۔ دراصل یہی استعارہ ہے۔

کنایہ:

کنایہ کہتے ہیں لفظ کو اس کے حقیقی معنی استعمال نہ کرنا بلکہ اس سے حقیقی معنی سے ملتا جلتا کوئی دوسرا معنی (مجازی معنی) مراد لینا۔ یہاں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ حقیقی معنی اور مجازی معنی میں کوئی لازمی تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً میر کی غزل کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ گل سے شاعر نے محبوب کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مجازِ مرسل:

کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی میں اس طرح استعمال کرنا کہ ان کے درمیان کوئی تشبیہ کا تعلق نہ ہو۔ مجازِ مرسل میں صرف مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں اور حقیقی معنی کو چھوڑ دیا جاتا ہے، جبکہ کنایہ میں حقیقی معنی سے ایک لازمی تعلق موجود ہوتا ہے۔ میر کا یہ شعر دیکھیے:

چارہ گری بیماری دل کی رسم شہر حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے

یہاں پہلے مصرعے میں لفظ: شہرِ حسن مجاز مرسل ہے۔ کیونکہ شہرِ حسن سے مراد کوئی حقیقی شہر یا جگہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد عاشق و معشوق کی دنیا، یا عشق کے دستور و رواج ہیں۔ یہاں شاعر نے علاقہ (شہر) استعمال کیا ہے لیکن مراد اس کے لوگ (محبوب، اہلِ حسن) ہیں۔ اسی لیے یہ علاقہ اور باشندہ کے تعلق پر مبنی مجازِ مرسل ہے۔ یعنی آسان زبان میں اس شعر کا مطلب یہ ہوا کہ اگر محبوب چاہے تو وہ بھی عاشق کے درد کو سمجھ کر اس کا علاج کر سکتا ہے، لیکن شہرِ حسن یعنی عاشق و معشوق کی دنیا میں ایسا کرنا معمول نہیں ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کیجیے۔

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

2.3 الفاظ و معنی

الفاظ	معنی
ناچار	مجبور
بے کسی	لاچاری، مجبوری
بیزار	تنگ، اُکتا ہوا
مدعی	فریاد کرنے والا
برق	بجلی
خارِراہ	راستے کا کانٹا، رکاوٹ
سوئے دشت	ویرانی کی طرف
آرسی	آئینہ
اختلاط	میل جول
جلوہ	نمود، دید
مزار	قبر
عجز	عاجزی
رقیب	حریف، محبوب کا دوسرا چاہنے والا
نگہ	نظر
شیوہ	انداز
نہاں	پوشیدہ
مہرِ قیامت	قیامت کا سورج

2.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

II

1۔

2۔

-3
-4
-5

2.5 خلاصہ

یہ اکائی اردو غزل کے دو ممتاز اور ہم عصر شعرا مومن خاں مومن اور داغ دہلوی کی غزلیہ شاعری کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ دونوں شعرا دہلی کے کلاسیکی شعری ماحول کے پروردہ ہیں اور ان کی شاعری میں عشق، جذبات، انسانی نفسیات اور زبان و بیان کی لطافت مرکزی حیثیت رکھتی ہے، تاہم اس کے باوجود دونوں کے مزاج، اسلوب اور طرزِ اظہار میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ اس اکائی کے ذریعے قاری کو اردو غزل کی فکری و فنی وسعت کا شعور حاصل ہوتا ہے۔

مومن خاں مومن کی غزلوں میں عشق کی سنجیدگی، جذبے کی گہرائی اور نفسیاتی پیچیدگی نمایاں ہے۔ مومن کے یہاں عشق ایک ہمہ گیر تجربہ بن کر سامنے آتا ہے جس میں عاشق کی داخلی کشمکش، احساسِ محرومی، ناز و نیاز اور خود احتسابی کی کیفیت غالب رہتی ہے۔ ان کی شاعری میں سوز، درد اور فکری لطافت پائی جاتی ہے۔ مومن کا انداز نسبتاً سنجیدہ، نازک خیال اور معنوی اعتبار سے گہرا ہے، جس میں فلسفیانہ جھلک اور جذبے کی تہہ داری نظر آتی ہے۔

اس کے برعکس داغ دہلوی کی غزلوں میں زبان کی شستگی، عوامی لب و لہجہ، شوخی، بے باکی اور اظہار کی سادگی غالب ہے۔ داغ نے عشق کو عملی، زمینی اور زندگی سے قریب تر صورت میں پیش کیا۔ ان کے اشعار میں محبوب کی نازک ادائیں، رقیب و ناصح سے چھیڑ چھاڑ، وعدہ و انتظار کی کیفیت اور عاشق کی بے قراری نہایت صاف اور دل نشیں انداز میں بیان ہوئی ہے۔ داغ کی شاعری میں محاورے، روزمرہ اور برجستہ اندازِ بیان اردو غزل کو نئی تازگی عطا کرتا ہے۔

یہ اکائی اس حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ مومن اور داغ دونوں نے اردو غزل کی روایت کو آگے بڑھایا، مگر اپنے اپنے جداگانہ اسلوب کے ساتھ۔ مومن نے غزل کو فکری و جذباتی گہرائی بخشی، جبکہ داغ نے اسے لسانی صفائی اور عوامی دلکشی عطا کی۔ دونوں شعرا کی شاعری مل کر اردو غزل کی ہمہ جہتی تصویر پیش کرتی ہے۔

مختصراً، اس اکائی کا خلاصہ یہ ہے کہ مومن اور داغ کی غزلیں اردو غزل کے دو اہم رخ ہیں: ایک طرف مومن کا گہرا، دردمند اور نفسیاتی عشق، اور دوسری طرف داغ کا شوخ، رواں، صاف گو اور دل نشیں اندازِ بیان۔ ان دونوں کے مطالعے سے اردو غزل کی فنی، لسانی اور جذباتی ثروت کا بھرپور ادراک حاصل ہوتا ہے۔

2.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں:

شعری صنعت کو پہچانیے

درج ذیل میں بتائیے کہ یہ تشبیہ، استعارہ یا کنایہ ہے (صرف صنعت کا نام لکھیں):

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل
تمام رات قیامت کا انتظار کیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

سادہ سوالات (ہر سوال کا جواب دو سے تین سطروں میں دیں)

'برقِ تبسم' میں مسکراہٹ کو کس چیز سے تشبیہ دی گئی ہے؟

محبوب کو 'قاتل' کیوں کہا گیا ہے؟

'قیامت کا انتظار' سے شاعر کیا شدت ظاہر کرنا چاہتا ہے؟

'بندگی سے چھوٹ گئے' میں اصل مطلب کیا ہے؟

خود بنائیے:

ایک سادہ جملہ لکھیں جس میں تشبیہ ہو۔

مثال: چاند سا چہرہ

ایک جملہ لکھیں جس میں استعارہ ہو۔

سمجھ کر جواب دیں

مومن اور داغ میں سے کس شاعر کی زبان آپ کو زیادہ آسان لگی؟ ایک وجہ لکھیں۔

کام کا تجربہ

Translate into Urdu:

1- Momin wrote romantic poetry.

2- Dagh used simple and sweet language.

3- Momin's poetry has deep emotions.

4- Dagh's ghazals are easy to understand.

5- Both poets wrote about love.

6- Dagh was famous in mushairas.

7- Momin used beautiful expressions.

8- Dagh's poetry has musical flow.

9- Momin's ghazals are popular among readers.

10- Dagh expressed feelings in a simple way.

2.7 مشقی سوالات

1۔ مومن کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ مومن کی غزلوں کے بارے میں اپنی معلومات تحریر کیجیے۔

3۔ داغ دہلوی کا تعارف پیش کیجیے۔

4۔ داغ دہلوی کی غزلوں کی امتیازات پر روشنی ڈالیے۔

2.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

1

2

3

اکائی 3 : فراق اور حسرت کی غزلیں

ساخت

3.0 مقاصد

3.1 تمہید

3.2 موضوع کی وضاحت

3.2.1 غزل1 سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں

3.2.2 فراق کی غزل کی بنیادی خصوصیات

3.2.3 غزل کی تشریح

3.2.4 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

3.2.5 غزلII بھلا تا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں

3.2.6 حسرت کی غزل کی بنیادی خصوصیات

3.2.7 غزل کی تشریح

3.2.8 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

3.2.9 علم بدیع

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

3.3 الفاظ اور معنی

3.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

3.5 خلاصہ

3.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں

کام کا تجربہ

3.6 مشقی سوالات

3.7 مزید مطالعے کے لیے کتب

3.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔۔۔۔

3.1 تمہید

فراقؔ گورکھپوری (اصل نام رگھوپتی سہائے) کی ولادت 28 اگست 1896ء کو ضلع گورکھپور کے قصبہ بنوار پار میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی جہاں اردو اور فارسی کا ذوق پیدا ہوا۔ میٹرک گورکھپور سے کیا، سینٹرل کالج الٰہ آباد سے بی اے کیا اور بعد ازاں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اپنی غیر معمولی علمی صلاحیت کے باعث وہ بغیر درخواست وانٹرویو الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے اور طویل عرصے تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

فراق کا سیاسی شعور نہایت بیدار تھا۔ وہ ابتدا میں انڈین سول سروس کے لیے منتخب ہوئے مگر 1920ء میں گاندھی جی کی تحریکِ عدم تعاون کی حمایت میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا، جس کے نتیجے میں انھیں جیل جانا پڑا۔ یہی واقعہ ان کے کردار، قومی وابستگی اور جراتِ اظہار کی واضح مثال ہے۔ فراق کی شاعری میں عشق، حسن، انسان دوستی اور تہذیبی شعور کی گہری آمیزش ملتی ہے۔ وہ کلاسیکی روایت سے جڑے رہتے ہوئے جدید حسیت کے نمائندہ شاعر ہیں۔ غزل، نظم، رباعی اور قطعہ ہر صنف میں ان کا رنگ نمایاں ہے اور اردو تنقید میں رومانی تنقید کی بنیاد بھی انھوں نے رکھی۔ ان کے شعری مجموعوں میں گل نغمہ، روحِ کائنات، روپ اور مشعل خاص طور پر اہم ہیں، جب کہ نثری تصانیف میں اردو کی عشقیہ شاعری اور اردو غزل گوئی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ عالمی ادب سے گہری وابستگی کے سبب انھوں نے ٹیگور اور شیکسپیئر جیسے ادیبوں کے تراجم بھی کیے۔

فراق گورکھپوری کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد اعلیٰ اعزازات سے نوازا گیا جن میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (1960ء)، پدم بھوشن (1968ء)، نہرو ایوارڈ، غالب اکیڈمی ایوارڈ اور 1969ء میں اردو شاعری کا پہلا گیان پیٹھ انعام شامل ہے۔ فراقؔ کا انتقال 3 مارچ 1982ء کو نئی دہلی میں ہوا اور الٰہ آباد میں سنگمِ گنگا و جمنا پر ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ فراقؔ اردو ادب میں ایک ہمہ جہت، باوقار اور عہد ساز شخصیت کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

اردو ادب اور ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں حسرت موہانی ایک ایسی ہمہ گیر اور منفرد شخصیت کے طور پر ابھرتے ہیں جن میں شاعر، صوفی، انقلابی، صحافی، نقاد اور مجاہدِ آزادی کی متعدد جہتیں بیک وقت جلوہ گر ہیں۔ ان کا اصل نام سید فضل الحسن تھا اور وہ یکم جنوری 1878ء کو اتر پردیش کے ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئے۔ تخلص حسرتؔ اختیار کیا جو آگے چل کر ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کی پہچان بن گیا۔ 13 مئی 1951ء کو لکھنو میں ان کا انتقال ہوا۔

حسرت ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، مگر ان کی زندگی سادگی، درویشی اور اصول پسندی کی مثال بن گئی۔ علی گڑھ مسلم کالج میں تعلیم کے دوران ہی ان کے ادبی اور سیاسی شعور کی تشکیل ہوئی۔ یہیں سے ان کے انقلابی خیالات نے واضح صورت اختیار کی۔ اعلیٰ سرکاری ملازمت کے مواقع موجود ہونے کے باوجود انہوں نے خود کو قوم، ادب اور آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا۔ علی گڑھ ہی سے انہوں نے اپنا مشہور ادبی و سیاسی رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' جاری کیا جس نے اردو صحافت اور تنقید کو نئی سمت دی۔

سیاسی اعتبار سے حسرت موہانی ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے نہایت جری اور بے باک رہنما تھے۔ وہ ''انقلاب زندہ باد'' کا تاریخی نعرہ دینے والے پہلے شخص تھے۔ انگریز حکومت کے خلاف گوریلہ جنگ کی وکالت، مکمل آزادی کا مطالبہ، سودیشی تحریک کی حمایت اور سرمایہ دارانہ سیاست پر تنقید ان کے انقلابی کردار کو واضح کرتی ہے۔ وہ کانگریس، مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی اور جمعیت علمائے ہند سب سے وابستہ رہے، مگر کسی ایک سیاسی خانے میں قید نہ ہو سکے۔ قید و بند کی صعوبتیں انہوں نے بارہا برداشت کیں، مگر ان کا حوصلہ کبھی پست نہ ہوا۔ قید ہی کے دوران ان کا مشہور شعر وجود میں آیا:

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے شاعر کی طبیعت بھی

اگرچہ سیاست میں حسرتؔ کی جدوجہد وقتی طور پر ناکام دکھائی دیتی ہے، مگر ان کی شاعری آج بھی زندہ اور تابندہ ہے۔ تنقید اور تحقیق کے میدان میں بھی حسرت کا مقام نہایت اہم ہے۔ ''مترو کاتِ سخن''، ''معائبِ سخن'' اور ''محاسنِ سخن'' جیسے رسائل کے ذریعے انہوں نے شاعری کی خوبیوں اور خامیوں پر اصولی بحث کو فروغ دیا۔ اردوئے معلّٰی کے ذریعے انہوں نے کئی گمنام شعرا کو متعارف کرایا اور کلاسیکی روایت کو جدید شعور سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کے تیرہ دیوان، جن کے دیباچے انہوں نے خود تحریر کیے، ان کی فکری وسعت اور تخلیقی توانائی کا ثبوت ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے اشعار کی تعداد سات ہزار کے قریب ہے، جن میں سے نصف سے زیادہ قید و بند کے زمانے میں کہے گئے۔

آزادی کے بعد حسرتؔ پارلیمنٹ کے رکن بھی رہے، مگر اقتدار، آسائش اور سیاسی مفاد سے ہمیشہ دور رہے۔ وہ آخری دم تک اصولوں کے پابند اور سادہ زندگی کے علمبردار رہے۔ ان کی وفات کے ساتھ ایک عہد ختم ضرور ہوا، مگر ان کی شاعری، انقلابی فکر اور اخلاقی جرأت آج بھی زندہ ہیں۔

اس اکائی میں ہم ان دونوں ہی اہم شاعروں کی غزل گوئی کی بنیادی خصوصیات و انفرادیت پر مختصراً بات کریں گے اور پھر ان کی منتخب غزل کے اشعار کے معانی و مفاہیم سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

3.2 موضوع کی وضاحت

3.2.1 غزلI

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہہ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطر بیمار شکیبا بھی نہیں

بات یہ ہے کہ سکون دل وحشی کا مقام
کنج زنداں بھی نہیں وسعت صحرا بھی نہیں

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں
تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراق سخن آرا بھی نہیں

یہ بھی سچ ہے کہ محبت پہ نہیں میں مجبور
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں

یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

فطرت حسن تو معلوم ہے تجھ کو ہمدم
چارہ ہی کیا ہے بجز صبر سو ہوتا بھی نہیں

منہ سے ہم اپنے برا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
ہے ترا دوست مگر آدمی اچھا بھی نہیں

3.2.2 فراق کی غزل کی بنیادی خصوصیات

فراق گورکھپوری اردو غزل میں ایک نئی، منفرد اور پہچانی جانے والی آواز کے ساتھ سامنے آئے۔ ان کی غزل ابتدا میں اپنی اجنبیت، کھردرے آہنگ اور غیر روایتی لہجے کے سبب قبولِ عام حاصل نہ کر سکی، بلکہ بعض ناقدین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ انداز زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکے گا۔ مگر وقت نے ثابت کیا کہ فراق کی غزل محض ایک وقتی تجربہ نہیں بلکہ ایک گہرا تخلیقی عمل تھی، جو آہستہ آہستہ قارئین کے ذوق اور طرزِ احساس کو بدلتی چلی گئی۔ محمد حسن عسکری کے مطابق فراق کی شاعری نے دس برس کے اندر اردو غزل کے مزاج اور احساس کو اس طرح متاثر کیا کہ نئی غزلوں میں فراق کا دیا ہوا لہجہ، محاورہ اور آواز صاف سنائی دینے لگی، یہاں تک کہ یہ کہنا پڑا کہ غزل کا یہ دور، فراق کا دور ہے۔

فراق کی غزل گوئی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اساتذۂ غزل کی محض پیروی نہیں کی بلکہ روایت کو توڑ کر اپنی الگ راہ بنائی۔ ان کی تخلیقی شخصیت کسی ایک سانچے میں قید نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ان کی شخصیت مشرق و مغرب، کلاسیکیت و جدت، فلسفہ و رومان اور تہذیب و فطرت کے متنوع اثرات کا حسین امتزاج تھی۔ اردو، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی ادب کے گہرے مطالعے نے ان کی غزل کو ایک وسیع تہذیبی پس منظر عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں میر کی نرمی، غالب کی فکری گہرائی، سنسکرت اور ہندی شاعری کی جمالیات، اور مغربی رومانیت سب یکجا ہو کر ایک نیا ذائقہ پیدا کرتی ہیں۔

فراق کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی حسیّت اور جذبے کی شدت ہے۔ وہ عشق کو محض روایتی محبوب و عاشق کے رشتے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے انسانی تجربے، جسمانی احساس اور روحانی آگہی تک وسعت دیتے ہیں۔ ان کا محبوب گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان ہے، جس کے حسن، جسمانی خدوخال اور جذباتی نزاکتوں کو وہ بے باکی مگر تہذیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس طرح فراق نے جسم و جنس کو محض لذت نہیں بلکہ احساس و ادراک کی سطح پر لا کر غزل کا حصہ بنایا۔

زبان و بیان کے اعتبار سے فراق کی غزل اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔ ان کی زبان نرم، شیریں، دھیمی اور ٹھنڈک لیے ہوئے ہے، جس میں ہندی اور ہندوستانی تہذیب کے الفاظ، محاورے اور استعارے بڑی خوب صورتی سے رچ بس گئے ہیں۔ مندروں کے چراغ، رات، سناٹا، تبسمِ صبح، بہار جیسے پیکر ان کی شاعری کو ایک ہندوستانی فضا عطا کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات میں ذاتی مشاہدہ،

تصویریت اور پیکر تراشی فراق کی غزل کو بصری حسن عطا کرتی ہے۔
فراق کی غزل میں رومانیت ایک اہم عنصر ہے، مگر یہ محض جذباتی نہیں بلکہ فکری اور تہذیبی رومانیت ہے۔ انگریزی رومانوی شعرا سے اثر قبول کرنے کے باوجود انہوں نے فطرت اور جذبات کو ہندوستانی ماحول میں ڈھال کر پیش کیا۔ ان کی غزلوں میں اداسی، تنہائی، یاد، محرومی اور زندگی کی بے ثباتی کے احساسات نہایت لطیف اور موثر انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔
اگرچہ فراق کی کثرتِ شاعری کے باعث ان کے ہاں کچھ کمزور اشعار بھی ملتے ہیں، لیکن ان کی غزلوں کا مجموعی اثر نہایت طاقت ور ہے۔ ان کی نکتہ رس طبیعت، وسیع مطالعہ، تیز ذہن اور گہرے مشاہدے نے غزل کو نئے تجربات، نئے موضوعات اور نئے آہنگ سے آشنا کیا۔ بعد کے شعرا، خصوصاً ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور دیگر جدید غزل گوؤں پر فراق کے اثرات نمایاں ہیں۔
مختصراً، فراق گورکھپوری کی غزل گوئی کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو روایت اور جدت کے سنگم پر ایک نئی توانائی، نیا لہجہ اور نئی تہذیبی وسعت عطا کی۔ ان کی غزل حسن و عشق، انسان دوستی اور گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہے، اور اسی بنا پر فراق اردو غزل کے ان چند بڑے ناموں میں شامل ہیں جن کے بغیر جدید غزل کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

3.2.3 منتخبہ غزل کی تشریح

یہ غزل فراق گورکھپوری کے فکری، نفسیاتی اور جذباتی کرب کی نہایت بلیغ ترجمان ہے۔ اس غزل میں عشق کی ایک ایسی کیفیت پیش کی گئی ہے جو نہ سراسر وابستگی ہے اور نہ مکمل بے نیازی، بلکہ ان دونوں کے درمیان معلق ایک پیچیدہ ذہنی و قلبی حالت ہے۔ شاعر ہر شعر میں نفی کے پیرائے میں اپنے باطن کی کیفیت بیان کرتا ہے، جس سے اس کی داخلی کشمکش اور بے یقینی نمایاں ہوتی ہے۔

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

شاعر کہتا ہے کہ نہ تو اس کے سر میں جنونِ عشق ہے اور نہ دل میں کوئی شدید تمنا، لیکن اس کے باوجود محبت کو ترک کر دینے کا بھی اسے یقین نہیں۔ یعنی وہ نہ پوری طرح عاشق ہے اور نہ مکمل طور پر آزاد، بلکہ ایک ایسی درمیانی کیفیت میں گرفتار ہے جہاں فیصلہ ممکن نہیں رہا۔

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہہ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر اپنی تنہائی اور بے تعلقی کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ شاعر کا دل نہ اپنوں میں شمار ہوتا ہے نہ غیروں میں، لیکن اس کے باوجود وہ محبوب کی جلوہ گاہِ ناز سے اٹھ کر جانے کی ہمت بھی نہیں کر پاتا۔ یہاں عاشق کی بے بسی اور دل کی وابستگی نمایاں ہوتی ہے۔

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ محض مہربانی کو محبت نہیں کہا جا سکتا، اور اب یہ بھی حقیقت ہے کہ محبوب کی ناراضی بھی بے جا نہیں رہی۔ اس شعر میں عشق کی حقیقت پسندی اور جذباتی پختگی جھلکتی ہے۔

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر یاد اور فراموشی کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مدت سے محبوب کی یاد نہیں آئی، مگر یہ کہنا بھی درست نہیں کہ وہ اسے بھول چکا ہے۔ یہ شعر انسانی شعور میں بسی ہوئی گہری مگر خاموش محبت کی بہترین مثال ہے۔

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطر بیمار شکیبا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر اپنی غفلت اور محبوب کی بیماری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج اس کی آنکھوں میں پہلے سے زیادہ بے خبری ہے اور محبوب کی بیماری کے لیے بھی اب وہ بے قرار نہیں رہا۔ اس شعر میں جذبات کی تھکن اور احساسات کی مدھم پڑتی ہوئی شدت نمایاں ہے۔

بات یہ ہے کہ سکون دل وحشی کا مقام
کنج زنداں بھی نہیں وسعت صحرا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر اپنے دل کی بے چینی اور آزادی کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ دلِ وحشی کو نہ تو قید خانے کا کنج سکون دے سکتا ہے اور نہ ہی صحرا کی وسعت، یعنی عاشق کو کہیں بھی قرار میسر نہیں۔

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں
تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر صیاد (شکاری) کو مخاطب کر کے طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ ہم کبھی پھول تھے اور کبھی بلبل، لیکن تو نے نہ ہماری آہ سنی اور نہ ہمارے حال پر نظر ڈالی۔ یہ شعر مظلومیت اور بے قدری کے احساس کو ظاہر کرتا ہے۔

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراق سخن آرا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر بزمِ احباب کی خاموشی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آج کی محفل میں نہ تو کوئی جوش ہے اور نہ فراق؟ جیسا سخن آرا موجود ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنی تنہائی اور سماجی بے رنگی کو نمایاں کیا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ محبت پہ نہیں میں مجبور
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر اعتراف کرتا ہے کہ وہ محبت پر مجبور نہیں، اور یہ بھی سچ ہے کہ محبوب کا حسن کوئی ایسا غیر معمولی بھی نہیں۔ اس شعر میں عشق کی خود آگاہی اور حقیقت پسندی نمایاں ہے۔

یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ دیوان؟ عشق عام طور پر ہنگامے برپا نہیں کرتا، لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ یہاں عشق کی مختلف صورتوں اور عاشق کی بے قراری کی طرف اشارہ ہے۔

فطرت حسن تو معلوم ہے تجھ کو ہمدم
چارہ ہی کیا ہے بجز صبر سو ہوتا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ حسن کی فطرت تمہیں معلوم ہے، اور صبر کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں، مگر صبر بھی آسان نہیں۔ یہ شعر عشق کے صبر آزما مرحلے کی عکاسی کرتا ہے۔

منہ سے ہم اپنے برا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
ہے ترا دوست مگر آدمی اچھا بھی نہیں

آخری شعر میں فراق اپنی خود تنقیدی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اپنے منہ سے برا نہیں کہتے ، یہ مانتے ہیں کہ وہ تمہارا دوست ہے، مگر ایک اچھا انسان بھی نہیں۔اس شعر میں طنز، خود احتسابی اور انسانی کمزوریوں کا بیان ملتا ہے۔۔

1.2.4 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

اس غزل کا مجموعی تاثر رنجِ محبت کی پختہ، سنجیدہ اور فکر انگیز کیفیت کو نمایاں کرتا ہے۔فراق نے یہاں عشق کو نہ جذباتی ہیجان کے طور پر پیش کیا ہے اور نہ رومانوی سرشاری کے رنگ میں، بلکہ ایک ایسی ذہنی اور قلبی حالت کے طور پر دکھایا ہے جس میں انسان یقین اور انکار، یاد اور فراموشی، وابستگی اور لاتعلقی کے درمیان معلق رہتا ہے۔غزل کا لہجہ نرم، مدھم اور اندرونی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ شاعر جذبات کی انتہا سے گزر کر ایک ٹھہراؤ اور فکری گہرائی تک پہنچ چکا ہے۔

اس غزل میں نفی کی تکرار (''نہیں... نہیں'') عاشق کی نفسیاتی الجھن اور عدمِ اطمینان کو شدت کے ساتھ ابھارتی ہے۔شاعر بار بار یہ بتاتا ہے کہ نہ دل مکمل طور پر آزاد ہے اور نہ محبت پر کامل اعتماد ممکن ہے۔یہ کیفیت عشق کی شکست نہیں بلکہ اس کی حقیقت پسندی ہے، جہاں جذبات اب خود فریبی سے نکل کر شعور کے دائرے میں داخل ہو چکے ہیں۔اسی لیے غزل میں شور، فریاد اور احتجاج کے بجائے خاموش کرب اور ضبط کا رنگ غالب ہے۔

فراق نے اس غزل میں فرد کی تنہائی، معاشرتی بے حسی اور انسانی رشتوں کی پیچیدگی کو بھی نہایت لطیف انداز میں سمو دیا ہے۔عاشق نہ اپنوں میں شمار ہوتا ہے نہ بیگانوں میں، اور نہ ہی صحرا یا زنداں کوئی سکون فراہم کرتے ہیں۔اس طرح غزل عشق کے ذریعے انسانی وجود کی بے گھری اور عدمِ مرکزیت کو ظاہر کرتی ہے۔محفل، دوست، صیاد اور بلبل جیسے استعارات اس احساس کو مزید گہرا کر دیتے ہیں کہ انسان اپنی حساسیت کے سبب سماج میں اجنبی بن جاتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ غزل فراق کی فکری رومانیت، نفسیاتی بصیرت اور انسانی تجربے کی سچائی کا آئینہ ہے۔اس میں عشق ایک ذاتی جذبہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی شعور، ضبط، شکستگی اور خود آگاہی کی علامت بن جاتا ہے۔یہی سنجیدگی، تہہ داری اور صداقت اس غزل کے مجموعی تاثر کو گہرا، اثر انگیز اور دیرپا بناتی ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

ایک جملے میں جواب دیجیے۔

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

1.2.5 منتخب غزل II

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترک الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں کیفیت صہبا کے افسانے
شراب بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قید ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشت خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرتؔ ترے ترک محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

1.2.6 حسرت کی غزل کی بنیادی خصوصیات

حسرت موہانی اردو غزل کی روایت میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔حسرت نے فارسی شعرا جیسے سعدی، جامی، نظیری اور اردو کے اساتذہ میر، غالب، مومن اور مصحفی سے بھرپور استفادہ کیا، مگر ان کی شاعری محض تقلید نہیں بلکہ روایت کی تخلیقی توسیع ہے۔ان کا اپنا رنگ اور آہنگ پوری طرح نمایاں ہے۔

وہ بنیادی طور پر خالص غزل کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری کا مرکزی محور عشق و محبت ہے۔ان کے ہاں عشق نہ محض جذباتی ہیجان ہے اور نہ صوفیانہ تجرید، بلکہ ایک زندہ، متحرک اور انسانی تجربہ ہے جو قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔حسرت کی عشقیہ شاعری میں خلوص، دردمندی اور صداقت نمایاں ہے۔ان کے یہاں حسن کو مختلف حالتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ان کی شاعری شباب کی شاعری ہے، جس میں پہلی نظر کی کشش، اجنبیت کا لطف اور جوانی کی کشمکش موجود ہے۔یہ شاعری نہ سطحی ہے اور نہ وقتی، بلکہ دیرپا اثر رکھتی ہے۔

حسرت محض عاشق نہیں بلکہ عشق کے فلسفی بھی ہیں۔وہ عشق کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں اور اسے انسان کے لیے راحت، سکون اور اخلاقی استحکام کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ان کے اشعار میں عشق انسان کو زندگی سے فرار نہیں دیتا بلکہ زندگی کے بوجھ اٹھانے کی قوت عطا کرتا ہے۔حسرت کو حسن کی مصوری میں خاص مہارت حاصل ہے۔وہ محبوب کے سراپا، حرکات و سکنات اور نفسیاتی کیفیتوں کو نہایت لطیف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ان کی جزئیات نگاری لکھنوی تہذیب کی شائستگی لیے ہوئے ہے اور پورے منظر کو زیادہ مؤثر بنا دیتی ہے۔

حسرت کا محبوب محض خیالی پیکر نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا کردار ہے، جس کی نفسیات، نازک حرکات اور ردِعمل کو شاعر بڑی مہارت سے پیش کرتا ہے۔ان کے محبوب میں انسانی جذبات، شرم و حیا اور ناز و ادا سب موجود ہیں۔

قدیم غزل کی روایت کے مطابق حسرت کے ہاں معاملہ بندی بھی نمایاں ہے۔ملاقاتیں، نگاہوں کا ٹکراؤ، بزمِ اغیار میں اشارے اور دبے ہوئے جذبات؛ یہ سب حسرت کی شاعری میں نہایت سلیقے سے جلوہ گر ہیں، جس میں نہ ابتذال ہے نہ بے باکی۔اگرچہ حسرت کی اصل پہچان عشقیہ شاعری ہے، مگر بعض اشعار میں ان کا سیاسی شعور اور انقلابی مزاج بھی جھلکتا ہے، خاص طور پر قید و بند کے تجربات کے حوالے سے۔

حسرتؔ کی زبان سادہ، سلیس اور پُراثر ہے۔انہوں نے لکھنوی شائستگی کو دہلوی سادگی کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ان کے اشعار میں تصنع نہیں بلکہ فطری روانی اور دل نشینی ہے۔حسرت کی بہت سی غزلیں مسلسل غزلیں ہیں، جن میں ایک کیفیت آغاز سے انجام تک برقرار رہتی ہے۔ان کے ہاں تغزل کی لطافت کے ساتھ ساتھ نظمیت کا شعور بھی موجود ہے، جس سے پوری غزل ایک وحدت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔حسرت کی شاعری کا لہجہ صحت مند، شگفتہ اور امید افزا ہے۔شدید ناکامیوں اور محرومیوں کے باوجود ان کے کلام میں یاسیت نہیں ملتی بلکہ زندگی پر اعتماد جھلکتا ہے۔

الغرض حسرتؔ موہانی کی شاعری عشق، حسن، خلوص، شگفتگی اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے قدیم اور جدید غزل کے درمیان ایک مضبوط پل قائم کیا اور اردو غزل کو سادگی، گہرائی اور دل نشینی عطا کی۔ یہی خصوصیات حسرتؔ موہانی کو اردو شاعری کے درخشاں اور ناقابلِ فراموش ناموں میں شامل کرتی ہیں۔

1.2.7 منتخبہ غزل کی تشریح

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ میں لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ محبوب کو بھلا دوں، مگر اس کے باوجود وہ برابر یاد آتے رہتے ہیں۔ حیرت اور بے بسی کے عالم میں شاعر خدا سے سوال کرتا ہے کہ جب میں نے محبت ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر محبوب کی یاد اس شدت سے کیوں ستاتی ہے۔ یہاں عشق کی بے اختیاری اور دل کی مجبوری نمایاں ہے۔

نہ چھیڑ اے ہم نشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

شاعر اپنے ہم نشیں (ساتھی) سے کہتا ہے کہ شراب اور سرمستی کی باتیں نہ چھیڑے، کیونکہ بے خودی کی شراب کے پیالے بھی مجھے محبوب کی یاد دلاتے ہیں۔ یعنی وہ چیزیں جو غم بھلانے کا ذریعہ سمجھی جاتی ہیں، اب خود یادِ محبوب کو اور تیز کر دیتی ہیں۔ اس شعر میں یاد کا ہمہ گیر ہونا نمایاں ہے۔

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

شاعر افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ہوش کی قید میں گرفتار رہتا ہے، جبکہ محبوب کی یاد اسے خود فراموشی کے صحرا میں بھٹکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہاں ہوش کو قید اور بے خودی کو آزادی کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مگر شاعر نہ مکمل ہوش میں سکون پاتا ہے نہ بے خودی میں نجات۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اس شعر میں شاعر یادِ محبوب کی نفسیاتی کیفیت بیان کرتا ہے۔ کبھی محبوب مہینوں تک یاد نہیں آتا، لیکن جب یاد آتا ہے تو بار بار، مسلسل اور شدت کے ساتھ آتا ہے۔ یہ یاد کا وہ طوفان ہے جو دل و دماغ پر مکمل قبضہ جما لیتا ہے۔

حقیقت کھل گئی حسرتؔ ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

مقطع میں شاعر اپنے تخلص کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ اب ترکِ محبت کی حقیقت اس پر واضح ہو گئی ہے۔ محبوب کو چھوڑنے کا فیصلہ دراصل یاد کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ گہرا کر گیا ہے۔ یوں ترکِ محبت بھی یادِ محبوب کا ایک نیا سبب بن گیا ہے۔

1.2.8 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

حسرت موہانی کی اس غزل کا مجموعی تاثر یادِ محبوب، عشق کی بے بسی اور دل کی ناگزیر وابستگی کے گرد گردش کرتا ہے۔ شاعر محبوب کو بھلانے کی شعوری کوشش کرتا ہے، ترکِ محبت کا ارادہ بھی کرتا ہے، مگر دل پر کسی اختیار کا قائل نظر نہیں آتا۔ یاد ایک ایسی داخلی قوت بن کر سامنے آتی ہے جو ہوش، ارادہ اور وقت سب کو شکست دے دیتی ہے۔ اس غزل میں عشق کو ایک ایسی سچائی کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس سے

انکار ممکن نہیں، چاہے انسان جتنا بھی ضبط اور فاصلہ اختیار کرے۔
غزل کا لہجہ نرم، مدھم اور درد میں ڈوبا ہوا ہے، مگر اس درد میں چیخ و پکار یا احتجاج نہیں بلکہ ایک وقار اور تہذیبی رکھ رکھاؤ ہے۔ حسرتؔ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ شدید جذبات کو بھی شائستہ اور متوازن پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ یاد کبھی مہینوں خاموش رہتی ہے اور کبھی شدت سے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے؛ یہ کیفیت انسانی نفسیات کی نہایت سچی تصویر پیش کرتی ہے۔ شراب، بے خودی اور ہوش جیسے استعارے یاد کی ہمہ گیری کو اور زیادہ گہرا بنا دیتے ہیں۔
مجموعی طور پر یہ غزل حسرتؔ موہانی کی عشقیہ شاعری کی بہترین مثال ہے، جہاں عشق محرومی کے باوجود زندگی سے فرار نہیں بلکہ احساس کی گہرائی عطا کرتا ہے۔ اس غزل میں شکست بھی ہے مگر یاس نہیں، بے اختیاری ہے مگر تلخی نہیں۔ یہی خلوص، سادگی اور دل میں اتر جانے والی کیفیت اس غزل کے مجموعی تاثر کو دیرپا اور اثر انگیز بناتی ہے۔

3.2.9 علم بدیع

علمِ بدیع علمِ بلاغت کی ایک شاخ ہے جس میں کلام کو خوب صورت اور مؤثر بنانے والے اسالیب وصنعتوں پر بحث کی جاتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ شاعر یا نثر نگار کے الفاظ میں رعنائی، دل کشی، موسیقیت، زورِ بیان اور اثر انگیزی پیدا ہو۔ یعنی علمِ بدیع یہ دیکھتا ہے کہ لفظوں اور معانی میں کیا خوبیاں شامل کی جائیں یا کس طرح بات کو زیادہ حسین، بلیغ اور یادگار بنایا جائے۔
علمِ بدیع کی دو اہم قسمیں: صنائعِ لفظی اور صنائعِ معنوی

صنائعِ لفظی:
وہ صنعتیں جن میں حسن الفاظ کی صوتی ترتیب، مماثلت، موسیقیت، تکرار، قافیہ بندی یا ظاہری بناوٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ صنعتیں لفظ کی سطح پر خوب صورتی پیدا کرتی ہیں، خواہ معنی میں بہت زیادہ تبدیلی نہ بھی ہو۔
غالب کی غزل کا پہلا شعر دیکھیے

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس شعر میں تکرارِ صوت یا سجعِ متوازن پایا جاتا ہے جو صنائعِ لفظی کی ہے ایک صورت ہے۔ 'ہوا کیا ہے' اور 'دوا کیا ہے' دونوں مصرعوں کے آخر میں ایک جیسی آوازوں کی ترتیب ہے۔ یہ ہم صوتی آہنگ (soundrhyming) کلام میں موسیقیت، روانی اور دل کشی پیدا کرتا ہے۔ یہی سجعِ متوازن یا صوتی تکرار ہے۔ آپ اسے یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے شعر میں ردیف و قافیہ کی وجہ سے شعر میٹھا لگتا ہے، اسی طرح یہاں دونوں مصرعوں کے آخر میں ایک جیسے الفاظ اور آوازوں کی تکرار نے صوتی حسن پیدا کیا ہے۔

صنائعِ معنوی:
وہ صنعتیں جن میں حسن الفاظ کے معنی، خیال، مفہوم، نکتہ آفرینی، تضادِ معنی یا معنوی ربط سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ صنعتیں خیال کی گہرائی، ربط اور ندرتِ معنی سے کلام کو مؤثر بناتی ہیں۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً تلمیح، مراعات النظیر، تضاد، ایہام، حسنِ تعلیل، مبالغہ، التفات وغیرہ۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

یہاں صنعت تضاد کے ذریعے شعر میں حسن پیدا کیا گیا ہے۔ شاعر کو 'وفا' کی امید ہے مگر وہ ایسے لوگوں سے یہ امید باندھے ہوئے ہے جو 'وفا کو جانتے ہی نہیں'، دراصل یہ معنی کا تضاد ہے جس سے شعر میں نکتہ آفرینی، طنز اور معنوی حسن پیدا ہوا ہے۔ یہ صنعتِ معنوی ہے کیونکہ

حسن معنی سے ابھر رہا ہے، لفظوں سے نہیں۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کیجیے۔

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

3.3 الفاظ و معنی

الفاظ	معنی
سودا	جنون، دیوانگی
ترکِ محبت	محبت چھوڑ دینا
یگانہ	اپنا، قریبی
بیگانہ	غیر، اجنبی
جلوہ گہِ ناز	محبوب کی موجودگی کی جگہ
رنجش	ناراضی، شکایت
بے جا	بلا وجہ
شکیبا	صبر کرنے والا
دلِ وحشی	بے قرار دل
کنجِ زنداں	قید خانے کا گوشہ
صیاد	شکاری
فطرتِ حسن	حسن کی سرشت
چارہ	علاج
ہم نشیں	ساتھی، دوست
صہبا	شراب
افسانے	قصے، باتیں
بے خودی	ہوش کا نہ رہنا
ساغر	جام، پیالہ
قیدِ ہوش	ہوش میں گرفتار ہونا
وائے ناکامی	افسوس، بدقسمتی

دشت صحرا
خودفراموشی اپنے آپ کو بھول جانا

3.4 خوداکتسابی سوالات کے جوابات

I

-1
-2
-3
-4
-5

II

-1
-2
-3
-4
-5

3.5 خلاصہ

فراق گورکھپوری اور حسرت موہانی کی غزلوں پر مشتمل یہ اکائی اردو غزل کی دو اہم اور مختلف مگر باہم مربوط شعری جہتوں کو سامنے لاتی ہے۔ اس اکائی میں عشق کو محض رومانوی جذبہ نہیں بلکہ ایک گہرا نفسیاتی اور فکری تجربہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ فراق کی غزل میں داخلی کشمکش، خود آگاہی اور جذباتی تھکن نمایاں ہے، جہاں عاشق نہ مکمل طور پر وابستگی سے آزاد ہو پاتا ہے اور نہ پوری طرح اس میں ڈوب جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں جدید ذہن، تجزیاتی شعور اور احساس کی پیچیدگی جھلکتی ہے۔

اس کے مقابلے میں حسرت موہانی کی غزل روایت سے گہرا رشتہ رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی، خلوص اور کلاسیکی عشقیہ کیفیت غالب ہے۔ یادِ محبوب، ترکِ محبت کی ناکامی اور دل کی بے اختیاری حسرت کی غزل کے مرکزی موضوعات ہیں۔ وہ جذبات کو بناوٹ کے بغیر، نرم اور دردآمیز لہجے میں پیش کرتے ہیں، جس سے غزل میں تاثیر اور سچائی پیدا ہوتی ہے۔ حسرت کے یہاں عشق ایک مستقل تجربہ ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔

یوں یہ اکائی طلبہ کو یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ اردو غزل ایک ہی جذبے یعنی عشق کو مختلف ادوار اور شعری مزاج کے تحت کس طرح پیش کرتی ہے۔ فراق کی غزل جدید شعری شعور اور نفسیاتی گہرائی کی نمائندہ ہے، جبکہ حسرت کی غزل کلاسیکی روایت، سادگی اور جذباتی سچائی کی مثال ہے۔ دونوں شعرا کی غزلیں مل کر اردو غزل کے فکری ارتقا اور فنی تنوع کو واضح کرتی ہیں۔

3.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں:

صنعت پہچانیے

(صرف نام لکھیں: تضاد، تکرار، مراعات النظیر، مبالغہ)

1۔ سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں

2۔ کنجِ زنداں بھی نہیں وسعتِ صحرا بھی نہیں

3۔ نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی

4۔ جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

خالی جگہ پُر کیجیے

1۔ ایک ہی لفظ یا فقرے کی بار بار تکرار کو _____ کہتے ہیں۔

2۔ دو مخالف معنوں والے الفاظ کے استعمال کو _____ کہتے ہیں۔

3۔ قید اور صحرا ایک ہی ماحول (جگہ) سے تعلق رکھتے ہیں، اس کو _____ کہتے ہیں۔

آسان تشریحی سوالات

(دو تین سطروں میں جواب دیں)

1۔ فراق کی غزل میں 'کنجِ زنداں' اور 'وسعت صحرا' کے ذریعے کون سی صنعت پیدا ہوئی ہے؟

2۔ حسرت کی غزل میں 'یاد' کی بار بار تکرار سے کیا اثر پیدا ہوا ہے؟

3۔ 'سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں' میں نفی کی تکرار شاعر کی کس کیفیت کو ظاہر کرتی ہے؟

خود مثال بنائیے

1۔ تضاد کی ایک سادہ مثال خود لکھیں۔

2۔ تکرار کی ایک مثال خود لکھیں۔

مختصر سرگرمی (کلاس ڈسکشن کے لیے)

فراق اور حسرت کی غزلوں میں آپ کو کون سی صنعت زیادہ نمایاں لگی؟ صرف ایک وجہ بیان کریں۔

کام کا تجربہ:

اردو سے ہندی میں ترجمہ کیجیے:

1۔ فراق کی شاعری میں تنہائی کا احساس ملتا ہے۔

2۔ حسرت نے عشق پر خوبصورت اشعار کہے ہیں۔

3۔ فراق کی زبان سادہ اور اثر انگیز ہے۔
4۔ حسرت کی غزل میں جذبہ نمایاں ہے۔
5۔ دونوں شاعروں نے اردو ادب کو مالا مال کیا۔
6۔ فراق کے اشعار میں فکر بھی پائی جاتی ہے۔
7۔ حسرت آزادی کے حامی تھے۔
8۔ فراق کی شاعری میں رومان بھی ہے۔
9۔ حسرت کی غزلیں آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔
10۔ فراق اور حسرت اہم شاعر ہیں۔

3.7 مشقی سوالات

1۔فراق گورکھپوری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2۔فراق کی غزلیہ شاعری کے بارے میں اپنی معلومات تحریر کیجیے۔
3۔حسرت موہانی کی شخصیت پر نوٹ تحریر کیجیے۔
4۔حسرت کی غزل گوئی پر تبصرہ کیجیے۔

3.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

1
2
3

اکائی 4 : جگر مرادآبادی اور ناصر کاظمی کی غزلیں

ساخت

4.0 مقاصد

4.1 تمہید

4.2 موضوع کی وضاحت

4.2.1 غزل1 وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ

4.2.2 فراق کی غزل کی بنیادی خصوصیات

4.2.3 غزل کی تشریح

4.2.4 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

4.2.5 غزلII دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی

4.2.6 حسرت کی غزل کی بنیادی خصوصیات

4.2.7 غزل کی تشریح

4.2.8 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

4.3 الفاظ اور معنی

4.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

4.5 خلاصہ

4.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں

کام کا تجربہ

4.7 مشقی سوالات

4.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

4.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔۔۔۔

4.1 تمہید

جگر مرادآبادی اردو غزل کے ایک عظیم اور مقبول شاعر تھے جنہیں بجا طور پر شہنشاہِ تغزل کہا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام شیخ محمد علی سکندر تھا اور 1890ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک علمی و ادبی خانوادے سے تھا؛ والد، دادا اور پردادا سب شاعر تھے، جس کی وجہ سے شعر و سخن کا ذوق انہیں وراثت میں ملا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اردو، فارسی اور قرآن کی صورت میں ہوئی، بعد ازاں انگریزی تعلیم کی کوشش کی مگر جلد ہی اسے ترک کر دیا۔

جگر نے رسمی تعلیم کے بجائے اہلِ دل اور بزرگ شخصیات کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اصغر گونڈوی سے ان کا تعلق زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا، جن کی رہنمائی میں ان کی شخصیت، فکر اور شاعری نکھری۔ جگر کی زندگی میں عشق، سرمستی اور بے اعتدالی کے ادوار آئے، مگر بعد میں ازدواجی استحکام اور روحانی رجحان نے ان کی زندگی کو سنوار دیا۔ آخری زمانے میں مذہب کی طرف گہرا میلان پیدا ہوا اور 1954ء میں حج کی سعادت بھی حاصل کی۔

ادبی اعتبار سے جگر مرادآبادی استاد شاعر تھے۔ بے شمار شعرا نے ان سے اصلاح لی۔ ان کے نمایاں شعری مجموعے داغِ جگر، شعلۂ طور اور آتشِ گل ہیں، جبکہ وفات کے بعد یادگارِ جگر شائع ہوا۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں پدم بھوشن، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، اعزازی ڈاکٹریٹ اور تاحیات پنشن سے نوازا گیا۔ 9 ستمبر 1960ء کو ان کا انتقال ہوا، مگر ان کا شعری ورثہ آج بھی زندہ اور تابندہ ہے۔

ناصر کاظمی جدید اردو غزل کے اہم اور منفرد شاعر تھے۔ ان کا اصل نام سیّد ناصر رضا کاظمی تھا۔ وہ 8 دسمبر 1925ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد محمد سلطان کاظمی فوج میں صوبیدار میجر تھے اور والدہ ایک تعلیم یافتہ خاتون اور اسکول ٹیچر تھیں۔ ناصر کی ابتدائی تعلیم مشن گرلز اسکول انبالہ میں ہوئی، بعد ازاں والدہ کی نگرانی میں کلاسیکی اور داستانوی ادب کا گہرا مطالعہ کیا، جس کے اثرات ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

ناصر نے مسلم ہائی اسکول انبالہ سے میٹرک کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا، مگر تقسیمِ ہند کے ہنگاموں کے باعث تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ نہایت کسمپرسی کی حالت میں لاہور آئے۔ ہجرت، والدین کی وفات اور معاشی تنگی نے ان کی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے۔

ناصر نے کم عمری میں شاعری شروع کر دی تھی اور ان کا ترنم بھی بہت دلکش تھا۔ عملی زندگی میں انہوں نے مختلف چھوٹی ملازمتیں کیں، مگر آخر کار ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے اور وہیں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اظہار کا وسیع میدان ملا۔ ریڈیو کے لیے انہوں نے کلاسیکی شعرا کے خاکے بھی تحریر کیے جو بے حد مقبول ہوئے۔ ناصر کاظمی کے شعری مجموعوں میں برگِ نَے، دیوان، پہلی بارش شامل ہیں، جبکہ نظموں کا مجموعہ نشاطِ خواب اور منظوم ڈراما سُر کی چھایا ہے۔ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ شدید بے اعتدالیوں اور بیماری کے باعث 2 مارچ 1972ء کو محض 46 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا، مگر ان کا شعری ورثہ اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اس اکائی میں ہم ان دونوں ہی اہم شاعروں کی غزل گوئی کی بنیادی خصوصیات و انفرادیت پر مختصراً بات کریں گے اور پھر ان کی منتخب غزل کے اشعار کے معانی و مفاہیم سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

4.2 موضوع کی وضاحت

4.2.1 غزل I

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

کبھی حسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی ناز بے نیازی وہی شان خسروانہ

یہ ترا جمال کامل یہ شباب کا زمانہ
دل دشمناں سلامت دل دوستاں نشانہ

یہ فلک یہ ماہ و انجم یہ زمین یہ زمانہ
ترے حسن کی حکایت مرے عشق کا فسانہ

یہ ہے عشق کی کرامت یہ کمال شاعرانہ
ابھی منہ سے بات نکلی ابھی ہو گئی فسانہ

یہ مرا پیام کہنا تو صبا مودبانہ
کہ گزر گیا ہے پیارے تجھے دیکھے اک زمانہ

مجھے چاک جیب و دامن سے نہیں مناسبت کچھ
یہ جنوں ہی کو مبارک رہ و رسم عامیانہ

تجھے حادثات پیہم سے بھی کیا ملے گا ناداں
ترا دل اگر ہو زندہ تو نفس بھی تازیانہ

میں ہوں اس مقام پر اب کہ فراق و وصل کیسے
مرا عشق بھی کہانی ترا حسن بھی فسانہ

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہیئے بہانہ

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

تری دوری و حضوری کا یہ ہے عجیب عالم
ابھی زندگی حقیقت ابھی زندگی فسانہ

مرے ہم صفیر بلبل مرا تیرا ساتھ ہی کیا
میں ضمیر دشت و دریا تو اسیر آشیانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد درد تنہا مرا غم غم زمانہ

ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک یہ شکست فاتحانہ

4.2.2 جگر مرادآبادی کی غزل کی بنیادی خصوصیات

جگر کی غزل کا مرکزی موضوع عشق ہے، جو محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر کیفیت بن کر سامنے آتا ہے۔ان کے ہاں عشق انسان کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اسے کرب و سرور دونوں سے آشنا کرتا ہے۔محبوب کی جدائی، تنہائی اور محرومی کے احساسات جگر کی غزل میں نہایت اثر انگیز انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں، مگر یہ درد قنوطیت میں تبدیل نہیں ہوتا۔جگر کے ہاں مایوسی کے ساتھ امید اور خودداری کا عنصر بھی موجود ہے۔ان کا عاشق کمزور نہیں بلکہ باوقار اور حوصلہ مند نظر آتا ہے۔

اگرچہ جگر بنیادی طور پر رومانوی شاعر ہیں، مگر ان کی غزل میں تصوف اور عشقِ حقیقی کی جھلک بھی ملتی ہے، جو ان کے روحانی تجربات کا نتیجہ ہے۔بعض اشعار میں زندگی، موت اور انسانی وجود کے مسائل پر غور و فکر ملتا ہے، جس سے جگر کی غزل محض عشقیہ شاعری نہیں رہتی بلکہ فکری وسعت اختیار کر لیتی ہے۔جگر نے نہایت سادہ، شستہ اور رواں زبان میں گہرے جذبات کو بیان کیا۔ان کے اشعار میں لفظی پیچیدگی نہیں، اسی لیے وہ براہِ راست دل پر اثر کرتے ہیں۔جگر کی غزلوں میں موسیقیت اور آہنگ نمایاں ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام مشاعروں میں بے حد مقبول رہا اور سننے والوں پر وجدانی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔

جگر مرادآبادی کی غزل اردو ادب میں رومان، جذبے، نغمگی اور روحانیت کا حسین امتزاج ہے۔انہوں نے سادہ زبان میں عشق کی ایسی تصویر کشی کی جو آج بھی دلوں کو مسحور کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جگر مرادآبادی کا نام اردو غزل کی تاریخ میں ہمیشہ احترام اور محبت سے لیا جاتا رہے گا۔

4.2.3 منتخبہ غزل کی تشریح

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

شاعر کہتا ہے کہ چاہے محبوب کی دلربا ادا ہو یا عاشق کی درد بھری صدا، اصل عظمت اسی میں ہے جو دلوں کو مسخر کر لے۔جو دل جیت لے، وہی زمانے کا سچا فاتح ہے۔یہاں ظاہری قوت کے بجائے باطنی تاثیر کو اصل کامیابی قرار دیا گیا ہے۔

کبھی حسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی ناز بے نیازی وہی شانِ خسروانہ

زمانہ بدلتا رہا مگر حسن کی سرشت نہیں بدلی۔محبوب کی بے نیازی، ناز اور شاہانہ وقار ہمیشہ ایک سا رہا۔حسن اپنی فطری خودداری اور شان میں ازل سے ابد تک قائم ہے۔

یہ ترا جمالِ کامل یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت دلِ دوستاں نشانہ

محبوب کے شباب اور کامل حسن کا یہ عالم ہے کہ دشمنوں کے دل بھی سلامت ہیں مگر دوستوں، یعنی عاشقوں کے دل نشانے پر ہیں۔حسن کی تابناکی عاشقوں کے دلوں کو ہی زیادہ زخمی کرتی ہے۔

یہ فلک یہ ماہ و انجم یہ زمین یہ زمانہ
ترے حسن کی حکایت مرے عشق کا فسانہ

آسمان، چاند، ستارے، زمین اور زمانہ — سب محبوب کے حسن اور شاعر کے عشق کی داستان ہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ حسنِ محبوب اور عشقِ شاعر کی گواہی دیتا نظر آتا ہے۔

یہ ہے عشق کی کرامت یہ کمالِ شاعرانہ
ابھی منہ سے بات نکلی ابھی ہو گئی فسانہ

یہ عشق کی کرشمہ سازی اور شاعری کی قوت ہے کہ زبان سے بات نکلتے ہی ایک مکمل داستان بن جاتی ہے۔ شاعر اپنے تخلیقی جوہر اور عشق کی تاثیر پر فخر کرتا ہے۔

یہ مرا پیام کہنا تو صبا مودبانہ
کہ گزر گیا ہے پیارے تجھے دیکھے اک زمانہ

شاعر ہوا (صبا) سے کہتا ہے کہ محبوب کو نہایت ادب سے یہ پیغام دے کہ اسے دیکھے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ یہاں جدائی اور تعلق کا درد نمایاں ہے۔

مجھے چاک جیب و دامن سے نہیں مناسبت کچھ
یہ جنوں ہی کو مبارک رہ و رسمِ عامیانہ

شاعر کہتا ہے کہ کپڑے پھاڑنا اور ظاہری دیوانگی دکھانا اس کی فطرت میں نہیں۔ ایسی عامیانہ رسمیں تو جنون کے حصے میں آتی ہیں، شاعر کا عشق زیادہ سنجیدہ اور باوقار ہے۔

تجھے حادثاتِ پیہم سے بھی کیا ملے گا ناداں
ترا دل اگر ہو زندہ تو نفس بھی تازیانہ

اے نادان! اگر دل زندہ ہے تو زندگی کی ہر سانس ہی تازیانہ ہے۔ مسلسل حادثات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا؛ اصل اذیت حساس دل کے زندہ ہونے میں ہے۔

میں ہوں اس مقام پر اب کہ فراق و وصل کیسے
مرا عشق بھی کہانی ترا حسن بھی فسانہ

شاعر عشق کی اس انتہا پر پہنچ چکا ہے جہاں وصال اور فراق کی تمیز ختم ہو گئی ہے۔ اب اس کا عشق بھی داستان ہے اور محبوب کا حسن بھی افسانہ بن چکا ہے۔

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہیئے بہانہ

زندگی تو جدائی کے سہارے کٹ گئی، اب شاعر کہتا ہے کہ موت کے لیے بھی کوئی بہانہ چاہیے۔ یعنی محبوب کی یاد ہی اس کی زندگی اور موت دونوں کا سہارا ہے۔

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

محبوب کے عشق کی یہ عظیم تاثیر ہے کہ زمانہ بھی شاعر کے پاس سے ادب سے گزرا۔ عشق نے شاعر کو وقار اور احترام عطا کیا۔

تری دوری و حضوری کا یہ ہے عجیب عالم
ابھی زندگی حقیقت ابھی زندگی فسانہ

محبوب کی دوری اور قربت نے زندگی کو عجیب کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے؛ کبھی زندگی حقیقت محسوس ہوتی ہے اور کبھی محض ایک افسانہ۔

مرے ہم صفیر بلبل مرا تیرا ساتھ ہی کیا
میں ضمیرِ دشت و دریا تو اسیرِ آشیانہ

اے بلبل! میرا اور تیرا ساتھ کہاں؟ میں تو صحرا اور دریا کی وسعتوں کا ترجمان ہوں، جبکہ تو گھونسلے کی قید میں ہے۔ شاعر اپنی فکری و جذباتی وسعت بیان کرتا ہے۔

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد دردِ تنہا مرا غم غمِ زمانہ

شاعر محبوب سے فرق واضح کرتا ہے کہ محبوب کا درد ذاتی ہے، جبکہ شاعر کا غم پوری دنیا کا غم ہے۔ شاعر خود کو اجتماعی درد کا نمائندہ سمجھتا ہے۔

ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگرؔ مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

محبوب کے دل ٹوٹنے پر اگر کسی کو ناز ہے تو ہو، شاعر (جگرؔ) کہتا ہے کہ اسے یہ شکست بھی فتح جیسی محسوس ہوتی ہے۔ عشق میں ہار بھی ایک عظیم کامیابی ہے۔

4.2.4 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

یہ غزل جگر مرادآبادی کی عشقیہ شاعری کا ایک بلند پایہ نمونہ ہے جس میں عشق کو محض ایک شخصی جذبہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر، تخلیقی اور باوقار قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کے نزدیک اصل فتح دلوں کو مسخر کرنا ہے، اسی لیے غزل کا آغاز ہی دل جیتنے کی قوت سے ہوتا ہے۔ حسن کی ازلی و ابدی شان، اس کی بے نیازی اور شاہانہ وقار کو نہایت نفاست کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جب کہ عشق کو زندگی، کائنات اور تخلیقِ شعر کا سرچشمہ بنا کر دکھایا گیا ہے۔ آسمان، زمین، وقت اور فطرت کے استعارے اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ شاعر کا عشق محدود نہیں بلکہ کائناتی وسعت رکھتا ہے، اور یہی وسعت اس غزل کو محض رومانوی نہیں رہنے دیتی بلکہ فکری گہرائی بھی عطا کرتی ہے۔

دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو غزل میں فراق، ہجر، درد اور ناکامی کے احساسات بھی موجود ہیں، مگر یہ درد شکست خوردہ نہیں بلکہ وقار اور شعوری قبولیت کا حامل ہے۔ شاعر جنون کی ظاہری رسموں سے انکار کرتے ہوئے ایک مہذب، سنجیدہ اور باوقار عشق کا تصور پیش کرتا ہے۔ یہاں ہار بھی فتح بن جاتی ہے اور شکست میں بھی سرخروئی کا احساس جھلکتا ہے۔ غزل کے آخری اشعار میں شاعر ذاتی غم کو اجتماعی غم میں ڈھال دیتا ہے، جس سے اس کی شخصیت ایک فرد سے بڑھ کر عہد کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ غزل عشق، حسن، درد اور وقار کا ایسا حسین امتزاج ہے جو قاری کو نہ صرف جذباتی طور پر متاثر کرتا ہے بلکہ فکری سطح پر بھی دیر تک اپنے اثر میں رکھتا ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

ایک جملے میں جواب دیجیے۔

1۔

2۔

3

4۔

-5

4.2.5 منتخب غزل II

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

کچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی
اور یہ چوٹ بھی نئی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تو شریک سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تم تو یارو ابھی سے اٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

4.2.6 ناصر کاظمی کی غزل کی بنیادی خصوصیات

ہجرت کا کرب ناصر کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔ ماضی کی یادیں، بچھڑے ہوئے لوگ، گم شدہ شہر اور چھن جانے والی زندگی ان کی غزل میں بار بار ابھرتی ہیں۔ انہیں بجا طور پر اداسی کا شاعر کہا جاتا ہے۔ تنہائی، خاموشی، محرومی اور دل گرفتگی ان کے ہاں مستقل کیفیات کی صورت میں جلوہ گر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رات ناصر کی شاعری کا ایک اہم علامتی استعارہ ہے۔ رات ان کے یہاں خوف، اداسی، یاد، خاموشی اور تخلیقی کرب کی علامت بن کر آتی ہے۔

البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر چہ ناصر کی شاعری میں اداسی غالب ہے، مگر ان کی غزل میں عشق اور رومان بھی موجود ہیں۔ یہ عشق عموماً ناکام، ادھورا اور یادوں میں بسا ہوا نظر آتا ہے۔ ماہرین نے بجا ہی کہا ہے کہ ناصر کی شاعری میں میر تقی میر کا درد اور سادگی، اور اختر شیرانی کا رومانوی لہجہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔

ناصر کاظمی کی غزل کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی ہے۔ وہ مشکل الفاظ، پیچیدہ استعارات اور تصنع سے گریز کرتے ہیں، مگر سادہ الفاظ میں گہری اور مؤثر بات کہہ جاتے ہیں۔ ناصر کی غزل میں ہلکی سی موسیقیت اور داخلیت پائی جاتی ہے۔ ان کا کلام خاموشی سے دل میں اترتا ہے اور قاری کو اپنی ذات کے اندر جھانکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

الغرض ناصر کاظمی کی غزل جدید اردو شاعری میں ایک منفرد آواز ہے۔ ہجرت کا کرب، ماضی کی کسک، اداسی، رات اور تنہائی ان کی شاعری کے نمایاں عناصر ہیں۔ انہوں نے سادہ زبان میں انسانی دکھ، یاد اور محرومی کو اس فنی صداقت سے بیان کیا کہ ان کی غزل آج بھی قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔ یہی ان کی شاعری کی اصل قوت اور دوام ہے۔

4.2.7 منتخبہ غزل کی تشریح

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شاعر کے دل میں اچانک ایک ہلچل سی پیدا ہوئی ہے، جیسے کسی نئی امید یا احساس نے جنم لیا ہو۔ تازہ ہوا سے مراد کسی نئے جذبے، یاد یا خیال کا آنا ہے جو دل کی فضا کو بدل رہا ہے۔

کچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی
اور یہ چوٹ بھی نئی ہے ابھی

شاعر اپنی حساس طبیعت کا اعتراف کرتا ہے۔ چونکہ دل نازک ہے اور زخم ابھی تازہ ہے، اس لیے درد زیادہ شدت سے محسوس ہو رہا ہے۔

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

دل کے گھر میں ہنگامہ برپا ہے، جیسے کوئی مضبوط دیوار گر گئی ہو۔ یہ دیوار تحفظ یا ضبط کی علامت ہے جو ٹوٹ جانے سے جذبات بے قابو ہو گئے ہیں۔

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

اگر چہ دنیا لوگوں سے بھری ہوئی ہے، مگر شاعر کا دل کہیں نہیں لگتا۔ کسی نامعلوم کمی یا خلا کا احساس اسے بے چین رکھتا ہے، جو دراصل محبوب کی عدم موجودگی ہے۔

تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا

ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

اگر محبوب گفتگو میں شریک نہیں تو کوئی بات نہیں، کیونکہ اس کی خاموشی ہی شاعر کے لیے گفتگو کا درجہ رکھتی ہے۔ خاموشی بھی معنی خیز ہو چکی ہے۔

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

یادوں کے دور اور گم نام گوشوں سے بھی محبوب کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ماضی کی دھندلی یادیں بھی ابھی زندہ ہیں اور شاعر کے دل سے وابستہ ہوئی ہیں۔

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

اندھیری اور ویران گلیوں میں بھی زندگی محبوب کو تلاش کر رہی ہے۔ یہاں شہر کی بے چراغ گلیاں تنہائی اور محرومی کی علامت ہیں۔

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

سب لوگ سو چکے ہیں، مگر ایک کھڑکی اب بھی کھلی ہے۔ یہ کھڑکی امید، انتظار یا بیدار احساس کی علامت ہے جو ابھی بجھا نہیں۔

تم تو یارو ابھی سے اٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

شاعر دوستوں سے کہتا ہے کہ تم تو جلد ہی جاگ اٹھے ہو، جب کہ شہر میں ابھی رات کا سناٹا اور بیداری دونوں باقی ہیں۔ رات یہاں فکر اور اضطراب کی علامت ہے۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

شاعر خود کو تسلی دیتا ہے کہ وقت بدلے گا اور اچھے دن بھی آئیں گے۔ زندگی ابھی باقی ہے، اس لیے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

4.2.8 منتخبہ غزل کا مجموعی تاثر

ناصر کاظمی کی یہ غزل ان کی مخصوص داخلی جذبات، نرم اور افسردہ شاعری کا نہایت خوب صورت نمونہ ہے۔ اس غزل میں کوئی بلند آہنگ خطابت یا جذباتی شور نہیں، بلکہ دھیمی آواز میں کہی گئی گہری باتیں ہیں۔ شاعر دل کی باریک کیفیات، ہلکی سی امید، تازہ زخم، خاموشی، یاد اور تنہائی کو نہایت سادہ مگر مؤثر اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ ہر شعر ایک لمحاتی کیفیت کو سمیٹتا ہے، جیسے دل میں اٹھنے والی ایک لہر، کسی دیوار کا گر جانا، یا کسی کھڑکی کا کھلا رہ جانا۔ یہ چھوٹے چھوٹے استعارے غزل کو گہری معنویت عطا کرتے ہیں۔

غزل کا بنیادی تاثر اداسی کے باوجود امید سے خالی نہیں۔ اگرچہ شاعر تنہائی، کمی اور بے قراری کا شکار ہے، مگر آخری شعر میں زندگی سے وابستگی اور بہتر وقت کی توقع نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہی ناصر کاظمی کی شاعری کا امتیاز ہے کہ وہ مایوسی کے اندھیرے میں بھی امید کی ایک مدھم روشنی جلا دیتے ہیں۔ یہ غزل قاری کو خاموشی سے متاثر کرتی ہے اور اس کے دل میں بھی وہی لہر سی پیدا کر دیتی ہے جس کا ذکر شاعر نے پہلے ہی شعر میں کیا ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کیجیے۔

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

4.3 الفاظ و معنی

الفاظ	معنی
ادائے دلبری	دل موہ لینے والا انداز
نوائے عاشقانہ	عاشق کی درد بھری صدا
فاتحِ زمانہ	زمانے کو جیت لینے والا
بے نیازی	لاپروائی، بے رغبتی
خسروانہ	شاہانہ، بادشاہوں جیسی
جمالِ کامل	مکمل حسن
فلک	آسمان
انجم	ستارے
کرامت	غیر معمولی تاثیر
صبا	ہلکی خوشگوار ہوا
چاک	پھٹا ہوا
جیب و دامن	لباس کے حصے
حادثاتِ پیہم	لگاتار مصیبتیں
تازیانہ	کوڑا، تنبیہ
فراق	جدائی
وصل	ملاپ
حضوری	قربت
ہم صفیر	ہم نوا
ضمیر	ترجمان، نمائندہ
اسیر	قیدی

شکستِ فاتحانہ	ایسی ہار جو فتح بن جائے
لہر	دل کی کیفیت، ہلچل
تازہ ہوا	نیا احساس، نئی امید
نازک مزاج	حساس طبیعت
شریکِ سخن	گفتگو میں شریک
ہم سخن	بات کرنے والا

4.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔
2۔
3۔
4۔
5۔

II

1۔
2۔
3۔
4۔
5۔

4.5 خلاصہ

اس اکائی میں جگر مرادآبادی اور ناصر کاظمی کی غزل گوئی، اسلوب اور فکری خصوصیات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جگر مرادآبادی کو اردو غزل کا بڑا اور مقبول شاعر مانا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا مرکزی موضوع عشق ہے جو صرف جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اور باوقار کیفیت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں درد، ہجر اور محرومی تو ہیں، مگر مایوسی نہیں۔ زبان سادہ، رواں اور نغمگی سے بھرپور ہے، اسی لیے ان کا کلام دل پر براہِ راست اثر کرتا ہے۔ منتخب غزل میں عشق کی عظمت، حسن کی شان اور شکست میں بھی فتح کا احساس نمایاں ہے۔

ناصر کاظمی جدید اردو غزل کے منفرد شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں ہجرت کا کرب، تنہائی، خاموشی اور اداسی نمایاں موضوعات ہیں۔ وہ سادہ الفاظ میں گہری بات کہنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں رات، خاموشی، کھڑکی، گلی اور ہوا جیسے استعارے بار بار آتے ہیں جو داخلی کیفیات اور محرومی کی علامت بن جاتے ہیں۔ منتخب غزل میں دل کی ہلکی سی کیفیت، تازہ زخم، کمی کا احساس اور مدھم سی امید کو نہایت نرم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

دونوں شاعروں کے اسلوب میں نمایاں فرق بھی ہے۔ جگر کے ہاں عشق زیادہ پُرجوش، کائناتی اور باوقار نظر آتا ہے، جب کہ ناصر کے ہاں

داخلی کیفیت، تنہائی اور خاموش اداسی غالب ہے۔ جگر کی غزل میں موسیقیت اور خطیبانہ آہنگ ملتا ہے، جبکہ ناصر کی غزل دھیمی، نرم اور اندرونی احساسات کی عکاس ہے۔

مجموعی طور پر یہ اکائی طلبہ کو اردو غزل کے دو مختلف مگر اہم رجحانات سے روشناس کراتی ہے۔ ایک طرف رومان، جذبہ اور وقار ہے، اور دوسری طرف داخلی کرب، یاد اور تنہائی۔ اس مطالعے سے غزل کی فنی خوبیوں اور اسلوبی تنوع کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

4.6 خود اکتسابی کے لیے مشق

تحریری سرگرمیاں:

درج ذیل اشعار میں صنعت پہچانیے

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

میں ہوں اس مقام پر اب کہ فراق و وصل کیسے
مرا عشق بھی کہانی ترا حسن بھی فسانہ

وہی نازِ بے نیازی وہی شانِ خسروانہ
کبھی حسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

تری دوری و حضوری کا یہ ہے عجیب عالم
ابھی زندگی حقیقت ابھی زندگی فسانہ

آسان سوالات

(دو سطروں میں جواب دیں)

1۔ 'دل میں اک لہر سی اٹھی ہے' میں شاعر کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟

2۔ 'کوئی دیوار سی گری ہے' سے کیا مراد ہے؟

3۔ جگر کے ہاں 'شکستِ فاتحانہ' کا کیا مطلب ہے؟

4۔ ناصر کے ہاں 'رات' کس بات کی علامت ہے؟

خالی جگہ پُر کیجیے

1۔ایک ہی لفظ کو بار بار دہرانے کو_____ کہتے ہیں۔

2۔دو مخالف معنوں والے الفاظ کو ایک ساتھ لانے کو_____ کہتے ہیں۔

3۔کسی چیز کو 'سی' کے ذریعے کسی اور سے ملانے کو_____ کہتے ہیں۔

خود مثال بنائیے

(بہت سادہ جملے لکھیں)

1۔تشبیہ کی ایک مثال لکھیں۔

مثال: چاند سا چہرہ

2۔تضاد کی ایک مثال لکھیں۔

مثال: دن اور رات

مختصر رائے

1۔آپ کو جگر کی شاعری زیادہ پُر جوش لگی یا ناصر کی زیادہ پُر سکون؟ ایک وجہ لکھیں۔

کام کا تجربہ:

اردو سے مراٹھی میں ترجمہ کیجیے:

1۔ جگر کی شاعری میں عشق کا ذکر ہے۔

2۔ ناصر کی غزل میں اداسی پائی جاتی ہے۔

3۔ جگر کی زبان سادہ اور رواں ہے۔

4۔ ناصر کی شاعری میں تنہائی کا احساس ہے۔

5۔ دونوں شاعروں نے غزل لکھی ہے۔

6۔ جگر مشاعروں میں مقبول تھے۔

7۔ ناصر نے ہجرت کا درد بیان کیا ہے۔

8۔ جگر کے اشعار میں موسیقیت ہے۔

9۔ ناصر کی غزل دل کو چھو لیتی ہے۔

10۔ جگر اور ناصر اہم شاعر ہیں۔

4.7 مشقی سوالات

1۔جگر مرادآبادی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔جگر مرادآبادی کی غزل گوئی کے بارے میں اپنی معلومات تحریر کیجیے۔

3۔ناصر کاظمی کی شخصیت اور زندگی پر نوٹ لکھیے۔

4۔ناصر کاظمی کی غزلیہ شاعری کے امتیازات پر روشنی ڈالیے۔

4.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

1

2

3